

”جہاں رہو، خوش رہو“  
قول مارف

ترتیب

7  
11  
19  
21  
33  
39  
47  
55  
61  
75  
89  
99  
111

7	مناہ سرخس	
11	مقدمہ	
19	مقدمہ ثانی	
21	عشق عشقینی و عشق	1
33	نہال عشقینی	2
39	نیم عشقینی پشاور میں	3
47	کوستان جنگ	4
55	سات دن سمندر میں	5
61	بھرو اور شائبہ یکپ	6
75	محرانے کیادہ اور برگڈہ آفسرز میں	7
89	نیم عشقینی بند او میں	8
99	مواصل سے طریق: پندرہ سو میل کا سفر	9
111	جنگ سے پہلے	10

UrduPhoto.com

## حناء سرناخن

خلع جہلم کے شکار خانہ بھورے کو ہستانوں میں سمنی اور پچلی ہوئی واوی جس میں کرنل محمد خان پیدا ہو کر پروان چڑھے ہیں ایک خاص وضع و انداز کے "محمد خانوں" کی سرزمین ہے۔ یہ حساب تو مجھے معلوم نہیں کہ محمد خان اول نے کس زمانے میں اس دھرتی پر قدم رکھا تھا۔ البتہ کہ قوش ایام کی رکاب تمام کر جتنی دور بھی پیچھے کی طرف دوڑ سکا ہوں ہر پشت کا پیشہ سپہ گری نظر آتا ہے۔ دراصلت میں ملی ہوئی سپہ گری اپنی مخصوص روایات میں دھن کا یہ دھنواں خطہ "بیالے سپاہی" کی آواز کا شکار اور جہان گندم و جو کے تابدار شگوفے پیدا کرنے کے لئے صدیوں سے مشہور و ممتاز چلا آتا ہے۔ آج بھی یہاں کا ہر محمد خان "قرب" قرب محمد خان اول کی سائے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ وہی سدرست و توانا محمد خان جس کا ایک ہاتھ تل کی ہنسی پر رہتا ہے اور دوسرا قبضہ شمشیر پر جو گھبہ ہونے پر یا علی کا نعرہ لگا کر پہلے عموماً "پڑ کوڑی" کے لیے چوڑے "پڑوں" اکھاڑوں میں دھومیں مچاتا ہے اور پھر وردی پن کر "ذحول سپاہی" کے روپ میں وطن عزیز کے مقدس پرچم کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیتا ہے۔ بانٹا "جری" بیالا۔۔۔ سخت جان و سخت کوش۔۔۔ اگر گھروں کی بیٹائی پر "مانو" لکھنے کا رواج ہو تو اس واوی کے اونچے نیچے کپے کپے ہر گھر کے دروازے پر نظیری کا یہ مصرع مرقوم ہوتا۔ ع

کے کہ کشتہ شد از قبیلہ مانیت!

11	روز جنگ	123
12	پسپائی بسوئے جٹا کیپ	131
13	قاہرہ ایام جنگ میں	139
14	چند روز عباسیہ کیپ [قاہرہ] میں	149
15	مل ایٹ سکتل سکول معادی [قاہرہ] میں	161
16	قاہرہ۔ آخری ایام	169
17	مراجعت بہ وطن	177
18	سیالکوٹ میں ایک سال	181
19	دیکائی سکتل سکول کی کمان	193
20	برما: برپادی و بحالی میں ہمارا حصہ	203
21	برما سے پاکستان براہ مدراس	213

یہ وہ محمد خان تھا جو اب کرنل کی وردی میں نظر آتا ہے، لیکن اس عرصے میں اس کے اندر اویب محمد خان بھی بیدار ہو کر باغ ہو چکا تھا۔ اویب محمد خان الف لیلی کی کہیوں اور مصرعے بازاروں اور شام کیارہ کے صحرائوں سے، ایک بھرپور سائولی سلونی اجنبی زندگی کے موتی رول لایا تھا۔ خواب، رنگ، روشنیاں، ستارے اور مسکراہٹیں، ایک سیلاب بہار، جس میں۔

رند جو عرف اہلایں دی ساغر میں جائے  
جس جگہ بند کے پی لیں دی سے خانہ بنے

”جنگ آد“ میں انہیں خوابوں، رنگوں، ستاروں اور مسکراہٹوں کی بارات فروزاں نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت اردو ادب کے اہم واقعات میں سے ہے۔ جس وسعت اور دلی گرم جوشی کے ساتھ اس کی پذیرائی ہوئی ہے، وہ اردو کی بہت کم کتابوں کے حصے میں آتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، سید علی عابد، مندر میر، مشتاق خواجہ اور صدیق سالک اور کئی دیگر نے اس نظر اور اس کمال نے جس انداز سے اس تخلیق پر داد و تحسین کے پھول پھلور گئے ہیں، وہ ہر معنی کے لئے قابل رشک اعزاز ہے، مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ”جنگ آد“ نے اردو ادب کو مزاح کے ایک بالکل نئے افق کی تازہ ہوا اور کشادہ فضا سے آشنا کیا ہے۔ یہ کتاب زندگی کے لئے بیش بہا مسرتوں کا خزانہ اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ کرنل محمد خان کو عمارت تک پہنچنے کے لئے کسی تمہید کا ”پل“ نہیں باندھنا پڑا، نہ وہ قہقروں کے ”جھوٹے“ آباد کرتے ہیں۔ واقعات کی گردن میں لطائف کی بھتی ہوئی گھنٹیاں بھی وہ آویزاں نہیں کرتے، ان کا لطیف اور چلبلا مزاح ان کے اسلوب تحریر کا جزو ہے، ان کے غلط نظریہ پیداوار ہے۔ ان کی عمارت کسی دلادہ خیالیان میں ہنسی مسکراتی، ٹھٹھکتی ہوئی ندی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے اور اپنے بہاؤ کے ظلم میں کناروں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔

انسانوں کی طرح کتابیں بھی قسما قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً ”بزرگ کتابیں“، ”بڑاں کتابیں“ وغیرہ وغیرہ۔ ”جنگ آد“ ایک ”دوست کتاب“ ہے یعنی ایسی کتاب جس پر دل

مکریہ شیردل لوگ، ”مانو“ لکھنے کے بہائے اپنے خون سے زندگی کی تاریخ لکھنے کے قائل ہیں۔ شعرد ادب کا افق یہاں ہمیشہ ہی سے کچھ دھندلا دھندلا سا رہا ہے۔ قبائے علم و ہنر یہ لوگ کم ہی پینتے ہیں۔ پینتے بھی ہیں تو جسم کے اوپر نہیں پینتے، روح کے اندر پینتے ہیں۔ کرنل محمد خان، انہی میں سے ایک ہیں۔ ماحول یا ورثے کے اعتبار سے ان کے اویب بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، مگر وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے، ع کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لائے کی ستابندی!۔ تو ہمارے دوست محمد خان کی شخصیت کی تفصیل کو فطرت ہی کی ”ستابندی“ کا مجرہ سمجھنا چاہئے۔

چنانچہ ان کی ذات میں دو الگ الگ، لیکن اپنی اپنی جگہ پر بھرپور شخصیتیں کار فرما نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہی مل اور نکوار والا محمد خان، اہم سخن و کم آواز۔ نہ ادائے کافرانہ، نہ تراش آواز نہ!۔ کہیت میں جٹ جائے، تو چٹانوں سے بوجے شیر کھینچ لائے، نکوار اٹھالے تو شگنوں کے نشیں، وہ پالا کر کے رکھ دے، وطن کا مان رکھتے کی آہ!۔

دوسرا محمد خان وہ ہے کہ اس ساو مرادے و سالی نام سے اس کے وہن و فکر کی شادابی اور برائی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اویب اور انشاء پر واز محمد خان ہے۔ نرم دم، ٹھنکو گرم دم، جستجو!، چمن مشرب، بہار ایہا!۔ خوش دل و گرم اختلاط، ساوہ و روشن جیوں!

مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں محمد خان ایک دوسرے کی نگلی نہیں، تائید کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کمک پہنچاتے ہیں، کیونکہ دونوں کی جڑیں ایک ہی مٹی میں چھوستے ہیں۔ محمد خان سپاہی ہو، کاشکار ہو، اویب ہو، دوست داری اور مرد محبت میں دونوں یکساں گرم جوش ہیں۔ اغلام و قحل میں فرد اور اکسار کا تو یہ عالم کہ۔۔۔ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے!

دوسری جنگ عالمگیر شروع ہوئی تو ملقات دھنی کا یہ نیم نشین، اپنی روایات کے مطابق فوج کی صفوں میں شامل ہو گیا، لیکن یونیورسٹی کی اپنی تمام تر تعلیم کے باوجود وہ ہنوز مل اور نکوار والا محمد خان ہی تھا۔ ایک مدت تک بھرہ اور شائبہ، بنداز اور موصل، قاہرہ اور طبرق میں گھومنے کے بعد جب وہ اپنے وطن میں واپس آیا تو ایک محمد خان کے جسم پر میدان جنگ کے قہقروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سپاہیانہ مصلحت کا وقار اور بالکھن روشن تھا۔

لوٹ کر آجائے۔ جس کے ساتھ وقت گزار کر آدمی دلی راحت محسوس کرے۔ جس سے پار پار گنگو کرنے کو جی چاہے۔ دوست جو خوش رو بھی ہے خوش مذاق بھی۔ شوخ بھی ہے اور دلوازا بھی۔ ذہین بھی اور فطین بھی اور ہنس کھاتا کہہ جسد۔ کمنے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی!

اور اب دیکھئے کرغ محمد خان کا انداز گل افشانی گفتار!

۱۳ مارچ ۱۹۶۸ء

۳۱ ڈی سٹنٹ ہاؤس۔ راولپنڈی

محمد خیر جعفری

مقدمہ

یہ کوئی ایسی معرکہ آرا یا انقلاب آور قسم کی کتاب نہیں کہ اس پر مقدمہ دائر کیا جائے اور دراصل مقدمے کے بغیر ہی چھپنے جاری تھی کہ ہمارے ایک نئی مزاج دوست رحمان مرزا خشتن تشریف لے آئے اور مسودہ لکھ کر کسی قدر طعنا فرماتے گئے۔

”تو یہ کتاب آخر چھپ کر رہے گی؟“  
عرض کیا۔ ”کوئی اعتراض؟“

بولے۔ ”دو ہیں۔ ایک تو آپ فنی ہیں دوسرے آپ کا نام بھی کاشت کارانہ سا ہے جب کام اور نام کا یہ عالم ہو تو لوگ سمجھا طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کو کتاب نویسی کا اشتغال کیسے آیا۔ یعنی کیا یہ فنی کی بجائے ایک مورچہ کھود ڈالا یا دو چار جیکے زمین جوت لی؟“

پھر خود ہی رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہنے لگے:

”چلو تمہارا فنی ہونا تو دن کچھ کے صدقے معاف کیا جاسکتا ہے لیکن نام کا کچھ علاج کرنا پڑے گا۔“

عرض کیا: ”آپ کی تشخیص ہے۔ آپ ہی علاج تجویز فرمائیں۔“

بولے: ”علاج آسان ہے اسی نام کے آگے پیچھے یا درمیان کوئی پیارا سا اپ نوٹ نام پیکالیں مثلاً انجم، ارم، سحاب، سرخاب، سروش، مستوش وغیرہ وغیرہ۔“

میں ابھی دل ہی دل میں محمد مستوش خاں کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ خشتن صاحب



"وہ موضوع ختم ہونے والا نہیں" لکھنی سیکھنے کے بعد اسے استعمال بھی کیا ہوگا؟ بس ترکیب استعمال پر ہی کچھ لکھ دو۔"

سوچا تو یاد آیا کہ کچھ کیا تھا؟ چنانچہ وہی لکھ دیا۔ (ملاحظہ ہو باب ۲)

اس کے بعد نہ "ہلال" کے خاص شماروں میں کمی آئی اور نہ ہماری لکھنی کے کارناموں میں حتیٰ کہ جگہ ختم ہو گئی۔ اب جو دیکھا تو ہمارا اہل نامہ مرتب ہو چکا تھا۔ فرشتوں سے تو پہلے ہی کہاں چھا تھا۔ اب انسانوں کی نظروں میں بھی آگیا سوچا کہ اب یہ نکایت عام ہوئی ہے۔ اب کچھ کیا؟ اسے ایک جگہ جمع کر دو۔ آگے چل کر دائیں ہاتھ میں لے گا یا بائیں ہاتھ میں؟ کم از کم وزن کا اندازہ تو ہو جائے۔

غفتان صاحب نے دو خاص اہم موضوعوں کے علاوہ جاتے جاتے ایک عام نکتہ کاموقی بھی بکیرا تھا کہ جس کتاب کا کوئی Message یعنی پیغام نہ ہو اس کا چھپنا بیکار ہے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ کتاب لکھتے وقت ہم اپنی پیغامبرانہ ذمہ داریوں سے قطعی طور پر بے خبر تھے۔ ہمارے ذہن میں تو ایک جگہ لکھنی تھی جس اور ہمیں گمان تک نہ تھا کہ ہم نسل انسانی کو کوئی ملوثی قسم کا پیغام پہنچا رہے ہیں بلکہ لکھنے کے دوران ہمیں کچھ احساس تھا تو فقط یہ کہ ہم بھی مضمون کی ہوا پاندہتے ہیں چنانچہ غفتان صاحب کے جواب میں ہمارا فوری فیصلہ تو یہی تھا کہ ہمارا کوئی "سیک" نہیں لیکن ذرا غور کرنے پر ایک واقعہ یاد آگیا جس سے شبہ ہونے لگا کہ ہماری کتاب شاید بالکل بے پیغام بھی نہیں۔

ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست اس کتاب کا ایک باب "ہلال" میں پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ پڑھنے کے دوران آپ ایک دو مرتبہ مسکرا دیئے۔ اس معمولی سے واقعہ سے ہم نے نیوٹن کی طرح ایک اہم نتیجہ نکالا اور وہ یہ کہ اگر یہی کیفیت ہر قاری پر گزرتے تو علم ریاضی کی رو سے لازم آتا ہے کہ ملک میں مسکراہٹوں کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور مسکراہٹوں کا جو توڑا ہمارے ملک میں ہے اس کا تو آپ کو علم ہی ہوگا۔ یورپی نظریہ (Beverly Nichols) نے اپنی کتاب Verdict on India میں لکھا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں فی مربع میل ناخوشی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے چنانچہ سوچا ہوں

ہوئے۔ "لیکن پرانے نام کی مرمت سے بھی کیا فائدہ؟ اسے سرے سے ترک کر کے ایک دم ماڈرن نام کیوں نہیں رکھ لیتے؟ مثلاً شمشاد عشرت، ارشاد شمیم، ریاض طلعت، فردوس نسیم وغیرہ۔"

غفتان صاحب تو مشورے دے کر تشریف لے گئے لیکن ہمیں سوچا چھوڑ گئے اور سوچا ہم نے یہ کہ غفتان صاحب کے تجویز کردہ نام ماڈرن تو ضرور ہیں لیکن ہیں ذرا مشکوک سے یعنی ان سے زیادہ کاسی پتہ نہیں چٹا اور پل بھی جائے تو ہر وقت کھٹکا سا لگتا ہے کہ کہیں اچھے بیٹے یا انگریزی لیتے جنس میں ہی ظلل نہ آجائے چنانچہ ہر چہ کہ ہمیں مختلف لطیف کا احترام منظور ہے، بالمثل ہمیں صنف غیر لطیف میں ہی رہنے کا شوق ہے اور محض فیشن کی خاطر اپنا مردانہ مستقبل مخدوش نہیں کرنا چاہیے لیکن غفتان صاحب کے اس سوال کا جواب دنیا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے کا استعمال کیسے آیا۔

غفتان صاحب قبلہ وہ یوں آیا: ایک دفعہ گاؤں کے کہ بجز مسعود احمد میر "ہلال" نے اپنے اخبار کے ایک خاص شمارے کے لئے کچھ لکھنے کا کہا۔ ہم نے جلد بازی میں نہ صرف وعدہ کر لیا بلکہ اپنے علم و فضل کی تیز روشنی سے کارنیم "ہلال" کی آنکھیں خیر کرنے کے لئے اپنے موضوع کا بھی اعلان کر دیا۔ یعنی "تیسرے گھر میں اقتصاد بھرتی کی بوقلمونیاں۔" لیکن بعد میں لکھتے بیٹھے تو عنوان کی تابانی سے ہماری اپنی آنکھیں چند حیا گئیں اور کچھ لکھ نہ سکے۔ تاریخ وعدہ قریب آتی نظر آئی تو ہمیں غیب سے ایک ایسا موضوع سوچا جو ہمارے کام اور شاید نام سے بھی مناسبت رکھتا تھا یعنی یہ کہ "ہم لکھنی کیسے بنتے۔"

یہ ایک طرح کا ادبی سورچہ ہی کھودا تھا۔ چنانچہ ہم نے دماغ اور پٹھوں کی مشترکہ مدد سے سوچا اور اپنے زور قلم اور زور بازو کے طفیل ایک مضمون بعنوان "لکھنی" لکھ ڈالا۔ جو "ہلال" میں شائع ہو گیا۔ یہی مضمون اس کتاب کا پہلا باب ہے۔ چند ماہ بعد "ہلال" کا ایک اور خاص نمبر چھپنے لگا تو میر "ہلال" نے پھر یاد فرمایا۔ اب کے ہم نے دیانت داری سے کام لیا اور اقبال کر لیا کہ "ہمارے پاس ایک ہی موضوع تھا جو کام آچکا ہے اور اب ہمارے اندر مزید مضمون نگاری کا مادہ ختم ہو گیا ہے۔" لیکن جناب میر ہنس کر کہنے لگے۔

لیں 'کتاب فور آہندہ' کو میں۔ خود اس خاکسار نے بزرگوں کی لکھی ہوئی کئی کتابیں شروع کیں۔ مگر دیا ہے سے آگے نہ گزر سکا اور کتاب کو ادب سے طاق پر رکھ کر دیوانہ گلاب کھول لیا۔ آپ اس کی جگہ ہشتی زیور یا پکی روٹی کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔۔۔ یوں بھی زندگی کی ایک منزل پر پہنچ کر غیر آزمودہ کتابیں پڑھنا ٹھیک نہیں۔ کل کلاں ان کتابوں سے نکیرن نے کوئی ایسا سوال پوچھ لیا جس کا آپ سے جواب بن نہ پڑا تو بخشش میں ناحق و بچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ یہ جواب سیکنڈ لیٹسٹ فیٹا آسانی سے دے سکتے ہیں 'سواگر آپ کسی وقت فوج میں رہ چکے ہوں یا کسی فوج میں رہ چکے ہیں' یا فضا صحبت ہی رہی ہے تو آپ کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ آپ جب چاہیں یہ کتاب بے کھنگے پڑھ سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ نکیرن کے امتحان میں کوئی سوال ایسا نہ پائیں گے جو سیکس سے باہر ہو۔

اگر دیا چوں پر چین کیا جائے تو کیا ہی کوئی کتاب ایسی ہوگی جسے مصنف نے برضا و رغبت لکھا ہو۔ کتاب لکھنے کی کسی بھی طور جاتی ہے لیکن جب تک مصنف کے دوست رشتہ دار اور جملہ ناچران سب اس کے ہاتھوں نہ پڑیں 'کتاب چھپنے میں نہیں آتی بلکہ مشاقان کتاب کا اصرار سال ہا سال جاری رہتا ہے' تا آنکہ مصنف آخر موت میں آکر ایک دن کڑوا گھونٹ پی کر کتاب چھپوانے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ قاعدے کی رو سے "جنگ آہ" کی طباعت کی داستان بھی کچھ ایسی ہونا چاہئے تھی کہ جو نئی کتاب کا آخری باب لکھا گیا 'دوست احباب' کے ہاتھوں پہنچ کر ہمارے آگے دست بستہ آجی ہوئے کہ خدا را اب قوم پر احسان کرو اور اسے زیور طبع سے آراستہ کر ڈالو۔ جواب میں ہم نے پس و پیش کیا تو وہ ایک وفد کی صورت مقامی ایم۔ این۔ اے کی سرکردگی میں ہمیں محضر ثامہ پیش کرتے آئے۔ ایک تیز طبع دوست نے بھوک بڑھال کر دی۔ دوسرے نے سر پھوڑ لیا 'چنانچہ آخر اس ڈر سے کہ ان آجیوں کو کہیں ایسی نہیں نہ لگ جائے جو قاتل دست اندازی پولیس ہو' ہم نے جی کڑا کر کے کتاب چھپوانے کی حاضری بھر لی۔۔۔ لیکن حضرات حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسی واردات پیش نہیں آئی۔ کتاب چھپوانے کا فیصلہ ہم نے تنہا کیا ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ اس کے چھپنے میں کسی کے چوت نہیں آئی۔

کہ اگر اکثر خواتین و حضرات کی توجہ دوسرے مشاغل سے ہماری کتاب کی طرف بٹ جائے تو نہ صرف فی مبلغ میل ناخوشی میں کمی کا امکان ہے بلکہ شاید فی مبلغ میل آبادی بھی گھٹنے لگے۔ بہر حال آبادی بڑھے یا گھٹے 'کتاب کا پیغام ضرور ہے اور یہ وہی مشہور پیغام ہے جو ایک عارف الہی نے ایک کم عارف الہی کو صرف چار لفظوں میں دیا تھا۔ 'دونوں دوست ترکم میں جا رہے تھے کہ کم عارف الہی کو تم میں لڑھک گیا۔ عارف نے دوست کو غائب پایا تو چلایا:

"کہاں ہو دوست؟"

"کوئی نہیں سے فریاد اٹھی۔" "یہاں ہوں۔"

عارف نے فی البدیہہ پیغام دیا:

"اچھا دوست 'جہاں رہو خوش رہو۔" اور گئے چل نکلا۔

یہ کتاب ایک لکھن کی جنگ جیتی ہے۔ اسی میں تصوف، فقہ یا علم الکلام پر مدد و دانش کوئی بحث نہیں کی گئی۔ اس میں صرف ان باتوں کا ذکر ہے جو سیکنڈ لیٹسٹ فیٹا آسانی سے کہہ سکتے ہیں خصوصاً زندگی میں پیش آتی ہیں۔ سیکنڈ لیٹسٹ فیٹا آسانی سے کہہ سکتے ہیں اور جوانوں کے پہلو میں آتا ہے۔ وہی دل جو کئی بزرگوں کے پہلو میں آتا ہے۔ وخت بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نوجوانوں کی زندگی کے کئی زاویے بزرگوں کو سمجھنے میں آتا ہے۔ حالانکہ نوجوان بزرگوں نے بھی جوانی میں انہی زاویوں پر غم کھایا ہوتا ہے 'بہر حال ان محترمین کی خدمت میں یہ بھی گزارش ہے کہ اس کتاب میں جہاں جنگ و جدل کا قصہ ہے وہاں پیش و سرور کی باتیں بھی ہیں۔ جہاں زہد و تقویٰ کا ذکر ہے وہاں ناؤ نوش کے قصے بھی ہیں۔ جہاں رکوع و سکود کا بیان ہے وہاں رقص و سرود کی داستان بھی ہے اور جہاں مردان اصیل کے کارنامے ہیں وہاں زنان جمیل کے سرنامے بھی ہیں۔۔۔ اس تمام این و آن کے باوجود اگرچہ بظاہر اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو غلط راہ پر ڈال دے 'تاہم قارئین گرامی! اگر آپ نے بچپن سال مکمل کر کے سرکاری طور پر بزرگی حاصل کر لی ہے تو مناسب ہے کہ مطالعہ میں احتیاط برتیں۔ یعنی پڑھتے پڑھتے اگر آپ کی بزرگی پر کسی قسم کا دباؤ پڑھنے لگے 'تو لازم نہیں کہ کتاب ختم کر کے ہی دم

سکول میں ہمیں ایسا شفیق اور صاحب ذوق استاد نہ ملا تو ہم دہلی صاحب بہادروں کی طرح ٹیڑھے منہ سے نیم لٹا انگریزی پڑھنا تو شاید سیکھ لیتے، لیکن اپنے قوی ادب کے ذوق سے محروم رہتے اور غدا! کتنی بڑی نعمت سے محروم رہتے۔

○ اور عزیز قاری! آپ کا جو پڑھتے پڑھتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کے پتلو میں ایک زندہ اور جوان دل ہے۔ میں نبوی تو نہیں، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لیے یہ سال اچھا ہے۔

محمد خان  
جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی  
۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

UrduPhoto.com

۱۔ اب شکستہ کرائی مسودہ احمدیہ ڈاکٹر محمد سید عظیم ربیعہ

۲۔ دہلی افواج لاہور دار بلڈ جو اس وقت روزنامہ تھا۔

دیباچوں کے آخر میں ایک سکہ بند جملہ ہوتا ہے کہ اگر قارئین نے اس حقیر کی تصنیف کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا، تو فقیر کو اطمینان ہوگا کہ حقیر کی منت رائیگ نہیں مگنی۔ میرے خیال میں یہ فقیر کی ہالاکاکی ہے، بلکہ اکسار میں لپٹی ہوئی دہشت انگیزی ہے۔ دراصل فقیر جو کچھ کہنا چاہتا ہے، یہ ہے کہ خوار جو کتاب پسند نہ کی ورنہ انجام بخیر نہ ہوگا۔ قاری عالی مقام! آپ پر اس کتاب کو پسند کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔ اگر آپ کو پسند آگئی، تو ظاہر ہے کہ آپ معقول آدمی ہیں اور اگر پسند نہ آئی تو بھی آپ کا قصور نہیں، صرف ایک بات واضح ہو جائے گی کہ آپ نہ کبھی نشین تھے، نہ اب ہیں اور نہ آنکھ ہوں گے، نہ اور نہ ممکن نہ ہوتا بھی کوئی بنیادی عیب نہیں۔ آپ ماشاء اللہ جھکے دار ہو سکتے ہیں، مگر کبھی وار ہو سکتے ہیں، مگر کبھی وار ہو سکتے ہیں اور اگر واقعی ہیں تو۔۔۔ اللہ آپ کی بکری زیادہ کرے۔۔۔ آپ کتابیں پڑھیں ہی کیوں؟ کتابیں پڑھیں آپ کے فٹ!

آخر میں ہمیں چند اصحاب کا ذکر کر لینے ہیں، جو اس کتاب کے محاورے ہمارے دوش بدوش شریک جنگ رہے اور ذکر کرتا ہے ہمیں:

○ محمد اکرم کا جنہوں نے مسودہ ٹاپ کر کے ثابت کر دیا کہ بد خطی لا علاج مرض نہیں۔

○ ماجد صدیقی اور مونس زبیری کا جنہوں نے صاحب شدہ مسودے کی نہ صرف تصحیح کی بلکہ ترمیم بھی کر دی۔

○ کرعل شفیق الرحمن اور مجرید ضمیر حفیظی کا جو فوجی ادیبوں کے حوالہ دہی میں سے ہیں اور جنہوں نے بکمال سپاہی پروری اس ریکروٹ کی بھی رہنمائی کی اور نہ صرف فون پر کتاب کی مزاج پرسی کرتے رہے، بلکہ ایک دو مرتبہ بہ نفس نفیس اس کی نبض پر ہاتھ بھی رکھا اور ازراہ اشک شوئی فرمایا کہ صحت بری نہیں۔

○ کرعل مسعود احمد کا جنہوں نے ایٹھ الٹی اشتعال کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ ان بے وضع اوراق کو اپنے حسن تدوین سے کتاب بنا دیا اور آپ کو پیش کرنے کی جرات اور رخصت بخش۔

○ مخدومی وکرمی ڈاکٹر نظام جیلانی برقی کا جن کے قدموں میں بیٹھ کر اردو لکھنا سیکھا اگر

## مقدمہ ثانی

جناب ناشر کا ارشاد ہے کہ جنگ آمد کے پھیلنے ایڈیشن کی طباعت کے موقع پر کچھ نکسوں۔

عرض ہے کہ بحیثیت مصنف مجھے خوشی ہے کہ کتاب کو چھٹا ایڈیشن نصیب ہوا ہے۔  
خاطر ہے کہ قارئین کے لیے شرف قبول بخشا ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی کتاب کی مقبولیت لانا اس کی مقبولیت کی بناء نہیں۔۔۔ کئی اچھی کتابیں پہلے ایڈیشن سے آگے نہیں بڑھتی۔۔۔ لیکن قبول عام سے حاصل قدرت کا عطیہ ہے اور اس کی تحقیر کفران نعمت ہے۔

سب سے بڑی نعمت جو یہ کتاب میرے لئے اپنے ساتھ لائی ہے وہ بے شمار اور بے ہما دوست ہیں۔ ان میں سے کئی تو اس قدر قریب آگئے ہیں کہ سوچتا ہوں یہ نہ ہوتے تو زندگی کس قدر بے رنگ ہوتی۔ لیکن ہزاروں ان دیکھے دوست بھی ہیں: وہ جو کبھی دو پیار کے لفظ لکھ بھیجتے ہیں لیکن بیشتر وہ جو کچھ کے بغیر دل ہی دل میں یاد کر لیتے ہیں۔۔۔ مجھ جیسے بے مایہ مفلس کے لئے اس سے بہتر کیا انعام ہو سکتا ہے؟ کسی غنی کے لئے بھی اس سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے؟

دیے جہاں تک کتاب کی اصل قدر و قیمت کا سوال ہے وہ کچھ ہمارا دل ہی جانتا ہے اور یا محترمہ بیگم بھی کاجنوں نے ہمیں ذیل کا قلم لکھا ہے:



”محترم کرل صاحب

آپ نے جنگ آمد لکھ کر بڑا احسان کیا ہے۔ میرا بیٹا جاوید جو کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگا تھا اب ہر وقت جنگ آمد میں محو رہتا ہے۔ جاوید ماشاء اللہ بڑا قائل بچہ ہے۔ اس سال چوتھی جماعت کا امتحان دے رہا ہے! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ دو چار اور ایسی ہی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اردو میں بچوں کے لڑیچہ کی سخت کمی ہے۔

## عشق لغٹینی و مشکلا

ہمیں ہٹلر سے بیش شکایت رہے گی کہ اس نے دو سری جنگ عظیم شروع کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ نہ کیا یہ نہیں کہ ہم جو صوف کو اس کا خیر سے روکنے کی کوشش کرتے۔ ہم فقط اعلان جنگ میں دو مہینے کا اہتمام چاہتے تاکہ اپنی تعلیم پوری کر لیتے، لیکن ہم بمشکل کرمیوں کی پٹھانیاں گزار کر کانچ پیسے ہی تھے کہ آپ نے ہم سے بالا بالا پولینڈ پر چڑھائی کر دی جس کا بعد میں ہمارے ذاتی پروگرام پر خاص گمراہ اثر پڑا۔

جنوری ۱۹۳۰ء میں ہر چند کہ پولینڈ اور ہٹلر کے دوسرے ہمسائے جرمن، بھارتوں اور نیکیوں کے دو میان ایسی پرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے تھے، تاہم باقی دنیا بفضل خدا خیریت تھے، حتیٰ اور ہمارے اپنے ملک ہندوستان میں تو انگریز کی برکت سے اس شدت سے امن برپا تھا کہ شیر بکری مع جملہ ہندوستانیوں کے ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے، چنانچہ صلح و آشتی کے اس خوشگوار ماحول میں کسی کو گمان تک نہ تھا کہ بین اس وقت ملک کے ایک گوشے میں ایک اہم جنگی واقعہ کی ابتداء ہو رہی ہے، یعنی لاہور میں ایک نوجوان کانچ چھوڑ کر جنگ میں کود پڑنے پر قتل کیا ہے۔۔۔ یہ نوجوان میں ہی تھا۔

لیکن بھرتی ہونے سے نہ تو ہٹلر کی دل آزادی مقصود تھی، نہ انگریز کی دلجوئی۔ ہمارے مراسم دونوں سے دوستانہ تھے۔ ہمیں فقط لغٹینی بننے کا شوق تھا اور قدرت اور ہٹلر نے مل کر

آپ کی مثنوی

بیگم بھٹی۔

محمد خاں

علی کسر۔۔۔ ضلع جلم

۱۵ نومبر ۱۹۷۲ء



پچا زادوں کا اعلا کر لیا تھا کہ جرنیل صاحب کو مطمئن کرنے کے بعد کچھ بچ بھی گئے تھے۔ بہر حال یہ راز ہمارے اور خدا کے درمیان ہی تھا۔ پولیس کی طرف سے معافی کی بھی شرط تھی تو ہم یوں بھی کبھی امن عامہ میں خلل نہیں ہوئے تھے، لیکن چونکہ پولیس والے بھی آخر انسان ہوتے ہیں، لہذا ہم نے احتیاطاً ان کی انسانیت کا تقاضا بھی پورا کر دیا تھا۔

شیلے سے گھر پہنچے تو لٹینی کے حکم کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اوپر چند جگت پسند بزرگوں نے ہماری لٹینی کے اعزاز میں جنگی دعوتیں دینا شروع کر دیں۔ جنیس ہم واجبی بڑھوڑوڑو کر افسرانہ وقار کے ساتھ قبول کرتے رہے۔ آخر ایک دن ڈاکیہ کھانا مارے کر آیا اور دور سے بولنے لگی: "لٹینی صاحب، لٹینی مبارک ہو۔"

لیکن تار پڑھا تو فقط آج لکھا تھا: "حمیس ادنی ایس سو میں ٹریننگ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ ۸ اگست ۱۹۴۰ء کو منتخب ہو جاؤ۔"

یہ پڑھ کر کچھ مایوسی تو ہوئی، لیکن پھر سوچا کہ آخر لٹینی ہے، یہ تو وڑا سی ہے کہ یوں اٹھا کر باٹ دی جائے۔ اس کے کچھ اوتے آداب سکھائے ہوں گے، کچھ خفیہ کرتائے ہوں گے کہ لٹینی چلائی کیسے جاتی ہے، چنانچہ خوشی خوشی دوستوں سے رخصت ہوئے۔ ہر طرف سے لٹینی صاحب کہہ کر پاراچار ہاتھ دھوئیں بے حد گوارا محسوس ہونے لگا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نشست و برخاست، دور لب و لہجہ سے بھی لٹینی پکڑنے لگی۔

دولت کے ستر کے لئے درجہ اول کا ٹکٹ ملا، یہ بھی ہماری عالیجادی کی علامت تھی۔ ٹکٹ دیکھنے والے ڈبے میں داخل ہوتے تو سر کہہ کر خطاب کرتے۔ خدا جانے انہیں کیسے محسوس ہو جاتا کہ یہ عام آدمی نہیں، لٹینی ہے، بہر حال ہم ان سے وہی سلوک کرتے جو ایک افسر کو درمیانہ درجے کے سرکاری ملازم سے کرنا چاہئے۔ ہم سفروں میں انگریز بھی تھے۔ یہ لوگ اگر ہم سے بولنا چاہتے تو پہلے کہتے: "معاف کیجئے گا" اور پھر عرض مدعا کرتے۔ ہمیں نہ صرف اپنی لٹینی کا یقین ہو گیا، بلکہ اس کی بلندی کا بھی احساس ہونے لگا۔ چنانچہ دلی سے آگے جب گاڑی میں ہم ایسے لٹینوں کی تعداد کافی ہو گئی تو موضوع گفتگو زیادہ تریبی رہا کہ لٹینی اور کپتانی میں آخر فرق کیا ہے؟ اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ معمولی فرق ہے۔ چنانچہ

اس شوق کی جھلک کا سامنا پیدا کر دیا تھا، چنانچہ ہم نے فوج میں کمشن کے لئے درخواست دے دی۔

ان دنوں ابھی وہ مصیبت نازل نہیں ہوئی تھی جسے آج کل سلیشن بورڈ کہتے ہیں۔ انڈیو تو خیر ان دنوں بھی ہوتے تھے، بلکہ ایک چھوڑ تین تین، لیکن نہایت شرطانہ قسم کے ایک بزرگ ساجرنیل اور کچھ نیم بزرگ سے ریگڈیر اور کرل پیٹھے ہوتے تھے۔ سامنے کرسی پر امیدوار کو بٹھایا جاتا تھا اور پھر اس سے نہایت بے ضرر سے سوال پوچھے جاتے تھے:

آپ کا نام کیا ہے؟

تعلیم کہاں تک ہے؟

فوج میں کوئی رشتہ دار ہے؟ وغیرہ وغیرہ

اور ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہر چند کہ کچھ خانہ دانی اسرار قاش کرتا پڑتے تھے، لیکن دماغ پر ایسا ناگوار بوجھ نہ پڑتا تھا کہ کھائے نہ اٹھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہلکا ہلکا اور خاصا مسرور قلب سا انڈیو ہوتا تھا۔ ان دنوں نہ تو امیدواروں کی فائیت کی بات کی جاتی تھی نہ ان کے لاشعور کی تلاشی لی جاتی تھی۔ یہ بد حمیس چند سال بعد کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ ہمارے دو انڈیو جہلم اور پنڈی میں ہوئے، پھر ہم کامیاب رہے۔ آخری انڈیو کے لئے حکم ملا کہ فلاں تاریخ شیلے حاضر ہو جاؤ۔ یہ سن کر ہماری کھجی کی انتہاء نہ تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر آخری انڈیو میں کامیابی نصیب ہو جائے تو انسان فی الفور لٹینی بن جاتا ہے۔ اور باقاعدہ لٹینی کرنے لگتا ہے۔ اس بات کا علم نہ تھا کہ آخری انڈیو اور لٹینی کے درمیان ٹریننگ کا ایک خاصا مسلک وقت بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم ایک نیم لٹینی کے عالم میں شیلے روانہ ہوئے اور جب انڈیو ہو چکا تو ہمیں محسوس ہوا کہ اب کسی لمحے سالم لٹینی ہوئے۔ کیونکہ انڈیو قسلی بخش قسم کا ہوا تھا۔ ہم میں کوئی ایسی بنیادی غالی بھی نہ تھی۔ تعلیم کی شرط میٹرک تھی اور ہم نے تو میٹرک کے علاوہ کافی فالتو تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ ہمارے خانہ دانی کی فوجی خدمات کی فہرست بے شک ایسی طویل نہ تھی، لیکن ہم نے شہرہ نسب کو تو ہوا سا سمجھنا تھا کہ اس قدر صوبیدار بچوں اور کپتان

”باہر تین ٹرک کھڑے ہیں، ہر ٹری ایک ایک ٹرک میں سوار ہو جائے۔“

ہمیں یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، کچھ بھی ہو، ہمیں ٹرکوں میں لے جانا شدید غلطی بلکہ بے ادبی ہے، موٹر کار میں ہونا چاہئے تھیں مگر سوچا کہ ان معمولی غامیوں سے الجھنا ہمیں زیب نہیں دیتا، چنانچہ ہم نے قلیوں کو آواز دی کہ ہمارا سامان ٹرکوں میں ہی رکھ دیں۔ ہمارا یہ کہنا تھا کہ گوراکر ج کر بولا:

”کیا کیا، قلی؟ تم فنی سکول میں آئے ہو، ہسپتال میں نہیں، اپنا سامان خود اٹھاؤ، ٹرکوں میں لاؤ اور اوپر بیٹھ جاؤ یا کھڑے رہو سمجھے؟“

کچھ ٹھنکائی اور ہماری خوش فہمیوں پر کچھ اوس بھی پڑی، لیکن ہم سب نے حتی المقدور جہال میں آکر اس بے ادب ہائی کو گمبے اور متفقہ غضب سے دیکھا اور کھڑے کھڑے فنی زندگی کا پہلا فیصلہ کر ڈالا کہ جو غلطی ہم نے اس گمبے کو کرے گا کورٹ مارشل کریں گے۔ اس دلیرانہ فیصلے پر ہر طرف سے مریض کی صدا اٹھی۔ اس وقت ہم کورٹ مارشل کو مارشل لا کا قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے۔ اور گورے کے مستقبل کو دل ہی دل میں تباہ کر کے ٹرکوں پر سوار ہو گئے۔

منزل مقصود کی جنگل تو قعات کے بہت غیر مشابہ تھی۔ ہماری جائے قیام کے خدو خال بنگلے کی نسبت خیل سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ ایک سنگین بلکہ سنگدل سی بارک تھی، تنگ و تاریک اور طویل، محض کے اندر دیواروں کے ساتھ آہنی چاربانیاں پڑی تھیں اور چاربانوں کے چھوٹے ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں جھٹکا سا لگا، گوراجیسے ہمارے خوف کو بھانپ گیا اور کڑک کر بولا:

”یہ تختیاں گگے میں لٹکانے کے لئے نہیں، محض تمہاری نشستوں کے قیمن کے لئے ہیں۔ اب اپنی اپنی چاربانیاں ڈھونڈ لو اور اپنا سامان وہاں اٹھا کر لے جاؤ۔“

ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ سامان اٹھانے اور چلنے پھرنے میں جتنی دیکھاؤ اور شور مت کرو۔ ہمیں یہ آخری حکم خاص طور پر ناگوار گزرا، ہم نے پرانے فوجیوں سے سن رکھا تھا کہ یہ نشین لوگ ہر وقت گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے رہتے ہیں، انہیں زبان بندی کا حکم نہ چھوٹنے

رہنم اور مو کے درمیان ہمارا مزاج عرش معلیٰ سے کچھ ہی اوجھڑا، بلکہ کئی ایک تو بلی زبان سے یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آخر ان تاریخ دانوں نے نیولین کو کیوں سرچ مار کھا ہے!

آخر مو کا شیش اُٹیا۔ توقع تھی کہ ہمارے استقبال کے لئے فوج کا دست آئے گا، جیڑ ہو گا، موٹریں ہوں گی جن کے ڈرائیور ہمارے لئے دروازہ کھولیں گے، اور باادب یا ملاحظہ ہمیں اپنے بنگوں تک پہنچا دیں گے، لیکن دیکھا تو یہاں کا بندوبست کسی قدر مختلف نظر آیا۔ استقبال کے لئے آدی تو تھے، لیکن ان میں ایسی وافر آدمیت نہ تھی۔ گاڑی رکی تو ہمارے ڈبے میں ایک گورادامل ہوا، جس کے بازو پر تین سفید دمچیاں لگی تھیں۔ آتے ہی بولا:

”اگر اس ڈبے میں کوئی کیڈٹ ہے، تو ابھی مت باہر نکلے۔“

ہم بیٹھ گئے، لیکن اس گورے کی زبان بے حد کھردری تھی۔ علاوہ ازیں کیڈٹ کا لفظ سن کر کچھ تشویش سی ہوئی کہ ہم سے کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا۔ نشین تو نشین ہوا، یہ کیڈٹ کیا جنس ہے؟ چنانچہ ہمیں ذرا پتہ سا شبہ ہونے لگا کہ ان انگریزوں نے نشین سے وصل کی کچھ خفیہ شرطیں بھی گھمراہ رکھی ہیں جن سے ہمیں پہلے کچھ نہیں کیا گیا۔ جب نشین دوسرے مسافروں سے خالی ہو گیا تو گورادامل پر آیا اور ہم سب کو گاڑی سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ باہر نکلے تو دوسرے ڈبوں سے بھی تیس چالیس ہم جنس حضرات نکلے دکھائی دیئے۔ نشین پر تین چار اور گورے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک جو بھارہ سیر تھا۔ اچانک چلایا:

”سب کیڈٹ میرے سامنے قطار میں کھڑے ہو جائیں۔“

ہم نے کسی قدر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کچھ بے دلی سے قطار بھی بنائی۔ گورادامل پھر چلایا:

”دائیں سے ایک دو تین بولو۔“

ہم نے حکم کی قبیل تو کی، لیکن محسوس ہوا کہ یہ سلوک ہماری شان کے شایان نہیں، آخر ہم رگھوٹ تو تھے نہیں جو قطاریں بناتے پھرتے یا گنتی شروع کر دیتے۔ بہر حال ہمیں تین ٹریوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر وہی گورادامل:

ڈوبے "اوھر نکلے" قصہ مختصر، پشتراس کے کہ ان مومن مڑوں کو کوئی گزند پہنچتا ہیرے پٹینیں اٹھا کر چل دیئے اور لٹکین صاحبان اپنا سامنہ اور چھری کانٹا لے کر رہ گئے۔۔۔ بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ ہیرا جو کچھ سامنے رکھ گیا ہے "اس کے ساتھ سلوک کیا کرتا ہے؟ چنانچہ کافی آنکھ سے ان انگریزوں کو دیکھتے اور پیچھے ان اماموں کے چچے اور کانٹے اٹھا کر رکھ دیکھو میں جانتے۔

کھانا ختم ہوا تو اپنی روم میں آئے اور کافی کا دودھ چلا، لیکن تھوڑی دیر بعد دونوں انگریز چائے پینے آئے اور یہ خوشگوار مجلس برخواست ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے درجہ زون صحبت یا رات کو چائے پینے سے اٹھ کر بارک میں واپس آئے تو وہی بد زبان گورا پہلے سے موجود تھا "سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"کل صبح سات سو بجے ٹی۔ ٹی کے میدان میں حاضر ہونا ہے۔ لباس، بنیان، نگر اور ریز کے جوئے۔"

اور اتنا کہہ کر اتر آیا اور اٹھ کر آیا یہ گورا باز میں آ رہا تھا۔ وہی حرکتیں کرتا تھا جو لٹکین کے منافی تھیں۔

کسی نے پوچھا۔ "ارے بار! یہ حالت سو بجے کس بلا کا نام ہے؟"

ایک صاحب بولے۔ "بے معنی بات ہے گورا! انگریزی غلط بول ہے۔"

ایک فنی کلید نے آہستہ سے کہہ دیا: اس کے معنی ہیں صبح سات بجے۔"

دن بھر کے جھگڑے تھے۔ صبح تیار ہوتے ہوتے ہم سے کئی ایک ٹی۔ ٹی کے لئے سات بجے سے ایک دو منٹ بعد پہنچے۔ کالج میں ہم گھنٹوں دیر سے پہنچا کرتے تھے اور اگر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر ایک آدھ ہلکی سی ٹھنک آجاتی تو لمبے بھر میں بغیر استری کے ہموار بھی ہو جاتی تھی، لیکن اس گورے نے جو ہمیں ذرا دیر سے آتے دیکھا تو کچھ اس انداز سے چلایا "گویا بھونپال آگیا۔ رہیں اس کی پیشانی کی ٹھنکیں" تو ان کی اصلاح کے لئے استری کی بجائے روڈ رو لرو کار تھا، معلوم ہوا کہ گورا محض پھٹ سی نہیں گیا، کچھ بول بھی رہا ہے۔ لیکن اس کی انگریزی اس انگریزی سے بہت مختلف تھی جو ہم نے کتابوں میں پڑھی تھی۔ گورے کے الفاظ تو خیر ہماری

منہ کی بہت بڑی بد تمیزی ہے۔ ایک حضرت بولے: ان جاہل گوروں کو کیا معلوم کہ ایک لٹکین کرنے پر آئے تو کیا کچھ کر سکتا ہے، لیکن کچھ سوچنے کے بعد ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ کورٹ مارشل تک باوقار خاموشی اختیار کرنا ہی قرین مصلحت ہے۔

شام ہوئی تو کھانے کے لئے Mess میں گئے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں سے لٹکین کے آثار نمایاں تھے، ہم سب ایک افسرانہ ٹھاٹھ سے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مودب اور باوردی بیروں نے ہماری خواہش کے مطابق مشروبات پیش کئے۔ اس خوشگوار ماحول میں ہم نے شیش اور بارک کے ان خوشگوار واقعات کو بھلا دیا جو ان گھٹیا خاندانوں کے گوروں سے سرزد ہوئے تھے اور ایک سردار کے عالم میں باہم گٹ پٹ گٹ پٹ کر رہے تھے۔ اسے میں دو خوش لباس انگریز اندر داخل ہوئے، یہ بھی فوجی وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے بازوؤں پر تین درجیاں نہ تھیں، بلکہ کندھوں پر پینل تھے تین تین چمکتے ستارے تھے۔ یہ افسر تھے اور وہ سارجنٹ، ان کی وضع قطع، بات چیت اور طور طریقوں میں شائستگی اور وقار تھا۔ انہیں دیکھا تو فخر سا محسوس ہوا کہ اصولاً ہم اور یہ افسر ایک ہی لڑی کے ہوتی تھے۔ آج نہیں تو کل ہمارے کندھوں پر بھی وہی جگمگ کرتے ستارے ابھرنے والے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لئے گئے۔ انگریزی کھانے اور دہی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اردو بولنے میں ہے۔ جس طرح ایک نو آموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں، اسی طرح ہمارا انگریزی "مزرگوشٹ" بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا۔ اوھر باتوں سے کھانا خلاف شان تھا، لیکن برضا و رغبت قاتل کرنا بھی ممکن نہ تھا، لہذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جاتے تو اردو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے، اسی طرح جہاں انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ لیتا، ہم آنکھ پھا کر انگلیوں سے سی بونی اپک لیتے۔ گویا انگریزی کھانا اردو میں کھا لیتے۔ بعض حضرات البتہ ایسے بھی تھے جو لٹکین کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز مطلق سے اتارتے ہی نہ تھے۔ ان میں سے کئی ایک کو دیکھا کہ چھری کانٹا لئے پلیٹ میں مڑوں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مڑوں کے اوھر ڈوبے اوھر نکلے "اوھر



ڈرل کے آغاز سے پہلے کپتان صاحب نے ہماری Turn Out یعنی یونیفارم وغیرہ کا معائنہ کیا اور معائنہ کیا کیا ہو گیا ہمیں خریدیں کے نیچے رکھ دیا۔ وہ عیب بھی ڈھونڈ نکالے جو درمیان قابلیت کا فرق نہ دیکھ پاتا یا دیکھ بھی لیتا تو نظر انداز کرتا۔ ہم نے ڈرل میں شرکت سے پہلے فوجی کیڈٹ کو بوٹ 'پٹی' 'نمبر' 'ٹین' 'پٹی' 'فلش' وغیرہ دکھائی تھی لیکن کمپنی کمانڈر صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی جیسے پہچان لیا اور فرمایا۔

"کیڈٹ نمبر 15" کلر پر ایک سفید ذرہ Incorrectly Dressed سزا تین ایکسٹرا ڈرل۔

سارجنٹ مجھے جو کاپی پنسل لئے کمپنی کمانڈر کے ارشادات قلمبند کر رہا تھا فوراً ہمارے اہل ہائے میں ہماری سزا کا اندراج کیا۔ کم و بیش ایسا ہی حشر ہر کیڈٹ کا ہوا۔ حتیٰ کہ ہمارے فوجی کیڈٹ بھی نہ بچ سکے جو ہر پیدای یونیفارم میں ہوئے تھے۔

اس کے بعد ڈرل شروع ہوئی اور خوب تیزی اور سستی سے حکم ملنے لگے۔ "سیدھے دیکھو" "جھانکیاں" "اوپر" "بازو ہلاؤ" "ہات" "ہلومت" "کھمبی مت اڑاؤ" "نہو مت" وغیرہ وغیرہ۔

ان سب میں "ہلومت" کے حکم پر عمل کرنا عذاب عظیم تھا۔ سیدھے بت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھجلی محسوس ہوتی ہے۔ اب ہاتھ کو جنبش دینا جرم ہے کہ نہ ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ کان کا خود ہلانا فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا فٹائے سارجنٹ

نہیں، "تین اس وقت ایک کھمبی ناک پر نازل ہوتی ہے۔ کھمبی کو فٹا کرنے کی بے پناہ خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن سارجنٹ سے آنکھ پھٹا کر انا کا تین سے آنکھ پھٹا ہے۔ "تھی پر دست درازی کا خیال آتا ہے" تو سارجنٹ گویا ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے اور اپنی کان کنی انگریزی میں چلا اٹھتا ہے۔ "Don't Kill No Fly" یعنی کھمبی مت مارو ہاتھ دیں کا

دیہیں سوکھ جاتا ہے اور کھمبی نہایت اطمینان سے ناک کے خیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے۔۔۔ ایسے اشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کشی تھی۔ اس وقت زندگی کی واحد خواہش صرف اتنی ہوتی کہ کب ڈرل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان

سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن ان کی تاخیر ہمارے دلوں میں آنا "لانا" سرایت کر گئی۔ کیونکہ اس کے ہر لفظ کے ساتھ ہماری رہی سہی نشینی بند رہی راجاں ہو رہی تھی۔

ہم خاموشی سے قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور اپنی فی شرع ہوئی پہلے تو ہمیں میدان کے ارد گرد دوڑایا گیا۔ یعنی ڈبل کرایا گیا۔ (ڈبل کے یہ معنی ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوئے) بعد ازاں چند ایسے زاویوں پر پھینکے کا حکم ملا جو فطرت کی فضا کے سراسر خلاف تھیں۔ کوئی آدھ پون پھینکے کی اپنی کے بعد ہم قہیر فطرت میں تو کسی قدر کامیاب ہو گئے، لیکن ہماری اپنی ترکیب عناصر میں خاصا غفل آگیا۔

آخر اپنی فتم ہوئی اور حکم ہوا کہ ہاتھ کے بعد پھر ہمیں حاضر ہونا ہے اور وقت نو سو تیس بجے کا ملا۔ فوجی کیڈٹ سے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ صبح کے ساڑھے نو بجے مراد ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی نکلا کہ یہ گورا کمپنی سارجنٹ مجھے جس کی نافرمانی ایک کیڈٹ کی عاقبت کے لئے سخت معزیت ہوتی ہے۔

ہاتھ کے بعد جب میدان میں پہنچے تو سارجنٹ بھر کو غیر حاضر ہوا۔ دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ غیر حاضر نہیں، ہم ہی وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔ گویا فوجی ضبط کی پہلی خوراک ہی اس قدر زور اثر تھی۔ صبح وقت پر سارجنٹ مجھ کو ہوا تو اپنی فتح پر ذرا مسکرایا۔ لیکن فوراً خمد ہو گیا اور ہمیں حکم دیا کہ کوارٹر ماسٹر سنور میں جا کر اپنے سائز کے بوٹ لے آؤ۔

بوٹ دیکھے تو محسوس ہوا کہ ہمیں پہننے کو وہ چیز دی جا رہی ہے جو گینڈوں کے پاؤں کے لئے زیادہ سوزوں ہے اور جب پن کر دو چار قدم پھلنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے ناک پر پت گھسٹ رہے ہیں۔ فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا کہ ان بوٹوں کے ساتھ تو ڈبل بھی کرنا پڑے گا۔ یہ سنا تو تمام سلسلہ قراقرم لہر اُڑا۔

دو تین دن خاکی کپڑوں کی تیاری میں صرف ہو گئے اور ٹریننگ کے سلسلے میں فقط اپنی ہوئی، لیکن جب خاکی یونیفارم تیار ہو گئی اور ہم نے بوٹ اپنی پہنتا سیکھ لیا تو باقاعدہ ڈرل شروع ہوئی۔

کیڈٹ سارجنٹ کی پورش سے لڑکھایا اور اضطراب میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔  
اس پر سارجنٹ دوسرے کیڈٹوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"ذرا دیکھنا، اب یہ حضرت برادر است خدا سے آدر لینا چاہتے ہیں۔"

پھر کیڈٹ کی طرف مڑ کر چلایا۔

"میری ٹانگ کی سیدھ میں دیکھو، خدا امت بلند لیل پر ہے۔"

پڑنے کے بعد اس کیڈٹ کا وزن خاصا ہلکا ہو چکا تھا۔

فطرت کے بعد تمام ہیڈ پرمائی یا پستول اور مشین گن وغیرہ کی سکھائی کے تھے۔ اگرچہ  
بچپن کے کھیل تک جانا بھی چپ راست یا ڈبل کے تابع تھا، تاہم کمروں کے اندر دست دیا  
کی حرکات پر پابندی نہ تھی نہ ٹیبلٹ کسی یا گھڑے سے محفوظ ہمارے بس کی بات تھی۔ ان کی تاباں  
پردہ از پر ہم حسب ضرورت ہاتھ پاؤں ہلا سکتے تھے اور فقط اتنی سی آزادی سے زندگی میں کیف  
پاتی تھا۔

رات کو اگر پرے کے توڑ پر اس موضوع پر تہہ تھا کہ ہماری فٹینی کس مرحلے پر ہے بلکہ یہ کہ ڈول  
میں بھی نافہ بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ فوجی کیڈٹ کے اس انکشاف پر کہ اتوار کو مکمل چھٹی ہوتی  
ہے، بے اختیار اس کا منہ چومنے کوئی چاہا۔ جہین نیاز میں فکر کے سجدے تر پنے لگے اور اللہ  
تعالیٰ کی بیکراں نعمتوں میں سے اتوار کی تعطیل کا خصوصیت سے احساس ہونے لگا۔ اتوار کا  
انتظار ہم سے زیادہ کسی نے نہ کیا ہو گا۔ اب ہماری تمام تردد مانیں چھٹیوں اور بارش کے لئے  
وقف ہو گئیں اور فٹینی کی عنایت کے لئے ہم نے اللہ تعالیٰ کو بھی مزید زحمت نہ دی۔

الغرض فٹینی کا وہ حسین و جمیل قصر جسے ہم نے تصورات کے مو قلم سے بنایا اور سجایا  
تھا، پہلے روزی مندم ہو گیا اور یہ ابھی ابتدا تھی جو کچھ آگے ہوا اس کی روداد طویل بھی ہے  
اور جاگمل بھی مختصر یہ کہ پہلی ڈول میں پاؤں لگا رہے تھے۔ چند روز میں رانکھل ملی تو  
سلوپ (Slope) کرتے کرتے ہاتھ بھی خوشنکاح ہو گئے۔ رانکھل پر سنگین کا اضافہ ہوا اور  
مصنوعی دشمن کو مارنے کی مشق کرانی جانے لگی، تو تقریباً خود کشی ہو کر رہ گئی۔ میلوں بے آب  
ودانہ مگر باطنی مارچ کیا۔ حتیٰ کہ ان لافروہوں کے دل بھی موم ہو گئے، لیکن کسی سارجنٹ کو

کھائیں اور ہاتھ خرب ڈول ختم ہوتی اور ہم ہلا خوف تصور کانوں کو چھو سکتے اور نکلیں کو اڑا  
سکتے، تو ہمیں محسوس ہوتا کہ کل کھانا کسی اڑانا بھی کس قدر عقیم عیاشی ہے، بلکہ اسی خوشی  
میں وہ آبلے بھی بھول جاتے جو ان آہنی یونوں کے اندر ہی بنے اور پھونٹے تھے۔

لیکن اس بے دریغ ڈول کا ایک پہلو ضرور تھا جس نے اس کی درشتی کو گوارا کر دیا تھا اور  
وہ تھیں ساربتوں کی لامتناہی پمبتیاں، جو وہ بے بس کیڈٹوں کی حرکات پر کستے تھے۔  
ساربتوں نے فقہ بعد نسل اس موضوع پر ایک سیدھ و دہندہ لڑچکر چھوڑا ہے جو اپنی  
تباہی کی وجہ سے زور طبع سے تو شاید کبھی آراستہ نہ ہو گا، لیکن اس ادب عالیہ کے ہلکے ہلکے  
ہونے کا بھی ایسا خطرہ نہیں، کیونکہ یہ شہ پارے بے شمار سپاہیوں کے ہونٹا سینوں میں محفوظ  
ہیں۔ ایک دن ڈول کرتے ہوئے میرے ساتھ کے کیڈٹ نے پھرتی سے دو تین غلطیاں  
کر دیں۔ تیسری غلطی پر سارجنٹ کا رنگ پہلے لال پھر بیڑا اور ہاتھ خرب ہوا۔ ایک لمحہ کے  
لئے جہاں کھڑا تھا وہیں رک گیا۔ پھر باقی دنیا و مافیہا سے قطع نظر کرتے ہوئے خطا کار کیڈٹ کی  
طرف بڑھا۔ جب سارجنٹ اور کیڈٹ کا درمیانی فاصلہ صفر تھا، یعنی دونوں کی ٹانگیں چھو رہی  
تھیں، تو سارجنٹ الفاظ میں ہیں کر شکار سے یوں مخاطب ہوا۔

"میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، ضبط تولید ضرور مجاز معلوم ہونے لگتا ہے۔"

انہی کے بے پناہ ریلے سے ہمارے منہ کھلنے ہی دلائے تھے کہ سارجنٹ کے منہ سے  
"ہنسوت" کا اینٹی دھماکہ برآمد ہوا۔ ہم نے دانت تو بچھنے لئے، لیکن ہماری اندرونی کیفیت وہ  
نازری سمجھ سکتا تھا جس کے پینے میں قوی سی مزید ہوا کی ضرورت ہو۔

بد قسمتی سے ہم میں سے ایک کیڈٹ ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار کھکھکھانے لگا۔ یہ  
سارجنٹ کے لئے دوسرا چیلنج تھا۔ اب کے ذرا بلند آواز سے مجرم سے مخاطب ہوا اور اسی  
پرانے مضمون کو سنے جانے میں پیش کیا:

"ذرا آپ ہی بتائیں کہ آپ نے پیدائش کی زحمت کیوں گوارا کی؟"

کیڈٹ ذرا کھسکا ہوا کرپنے دیکھنے لگا، تو سارجنٹ گرجا۔

"اوپر دیکھو، زمین کا معائنہ بھٹی صبح سویرے کر دیتا ہے۔"



## نزول لفٹینی

ٹرننگ کا چھتا مینہ تھا کہ سکیل کی تربیت کے لئے دس کینڈوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب امیدواروں کو ایک علیحدہ ادارے یعنی سکیل ٹرننگ سنٹر میں جانا تھا۔ شاید یہ ایکسٹراڈول کا خوف تھا کہ ہر کینڈ نے اوئی ایس سے جان چمڑانے کے لئے عرضی دے دی کیونکہ اوئی ایس خیر حقیقی سکیل ٹرننگ سنٹر میں کینڈ بھی انسانوں میں شمار ہوتا ہے اور جب ہمارا نام دس منتخب کینڈوں کی فہرست میں آیا تو باقی کینڈ بھی ہمیں اس طرح مبارک باد دینے آئے جیسے جشن استقلال کی خوشی میں قمل از وقت رہا ہونے والوں کو پس ماندہ قیدی رخصت کرتے ہیں۔

سکیل ٹرننگ سنٹر بھی ہو میں تھا اور اوئی ایس سے بہت دور نہ تھا۔ جس روز ہم اوئی ایس سے رخصت ہوئے ہمارے ذمے دو چار ایکسٹراڈول باقی تھیں اور ہمیں خوف تھا کہ کینڈ سکیل ٹرننگ سنٹر میں پہنچنے کے بعد بھی اوئی ایس والے اس اوحار کی ادائیگی کا مطالبہ نہ کریں گے۔ اتفاق سے دو دن بعد اوئی ایس کا سمارٹنٹ میجر سکیل سنٹر میں آگلا اور ہمارا مانتا ٹھکانا کہو نہ ہو یہ ایکسٹراڈول کا حساب چکانے آیا ہے لیکن جب اس نے عام انسانوں کی طرح ہم سے ہاتھ ملایا اور اسی طرح مسکرائے بھی لگا جس طرح ہم آپ مسکراتے ہیں تو باور نہ آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو تم کھا کر کھاتا تھا کہ کینڈ خدا کی اسفل ترین مخلوق ہے۔ لیکن ابھی ہمارے لئے آخری حیرت باقی تھی۔ جب پیار محبت کی باتوں کے بعد ہم سے

رقت نہ ہوئی۔ مسلسل کھدائی سے ارض مو کا سینہ شق ہو گیا لیکن کینڈی کمانڈر کا دل نہ پھٹا۔ کمانڈنٹ صاحب نے ہمارے کھودے ہوئے مورچوں کے ہر خط اور زاویے کا جائزہ لیا لیکن ہمارے زخم جگر کی خبر نہ لی۔ ٹھکانے کے چپے پر ہم نے رنجور قدموں کے نعوش چھوڑے۔ ہیرا پھار کی ہر سنگریز پر ہم نے آبلے چھوڑے۔ ہماری ہر صبح چوٹی گھوڑے پر سے کودنے اور رے پر چڑھنے میں صرف ہوئی اور ہماری ہر شام بے صبح اور بد ذائقہ انگریزی ڈنر کی وجہ سے حرام ہو گئی۔ ایکسٹراڈول سے پہنچنے کے لئے ہسپتال میں داخل ہونے کی بار بار کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہی کھانے کے لئے باورچی کی پڑاؤ نہیں لیکن چھین بد بخت سمارٹنٹ کے ڈر سے راضی نہ ہوا۔ جی چاہتا کہ اگر سمارٹنٹ کو تیس تو کم از کم باورچی ہی کو قتل کر ڈالیں لیکن اگر اس کی ہمت بھی ہوتی تو قہرمت کہاں تھی؟ اور آخر ایک روز فرصت ملی تو معلوم ہوا کہ لفٹین ہونے لگی ہیں!

لیکن یہ لفٹینی ہم پر دوسرے جتنے ہی ناٹلی نہیں ہو گئی تھی بلکہ اس کی پیدائش کے لئے ہمیں بے چاری نرمی کی طرح پورے نو مہینے باقی تھے نووی ہر روز پڑاؤ چھیننے کی نالی کھڑے کی تاہم پر کہہ سکتے ہیں کہ رات

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چنانچہ دیر دور پیدا

- 1۔ اس وقت پاکستان ابھی دو دہائی نہیں کیا تھا۔
- 2۔ لفٹینی
- 3۔ اوئی ایس سے مراد آفیسر ٹرننگ سکیل ہے جو اندازے جنگ میں مو (ملا ہوا) میں کھو گیا تھا۔
- 4۔ فوٹیکل ٹرننگ سکیل ورڈ
- 5۔ ایکسٹراڈول جیسا کہ نام سے ظاہر ہے معمولی طور کی سڑک پر چھلے پر گرانی جاتی تھی۔ جب دوسرے لوگ تھریج میں مشغول ہوتے تھے خاص طراباک چڑھتی۔
- 6۔ لندن کے فیر فیئر یا فوڈ کی زبان
- 7۔ ہر سارہ سالانہ کارڈوئی قید ہے جو اس وقت گزرتے وقت پشہر افلا جاتا ہے۔
- 8۔ سڑک کے نواح میں ایک سڑک ہے جس پر اکثر مارچ کیا جاتا تھا۔
- 9۔ جیسا کہ مشہور پھاڑی کا نام ہے 'نہ سو سے چھ میل دور ہے اور جہاں اکثر فوڈی لفٹینی کی ہالی تھی۔

رخصت ہونے لگا تو ہمیں سرکہ کر خطاب لیا چہی سے بیٹھ کر اس قدر غیر متوقع تھے کہ اگر اسی لمحے کوئی شہزادی اجازت مانگی۔ یہ واقعات ہمارے لئے اس قدر غیر متوقع تھے کہ اگر اسی لمحے کوئی شہزادی ہمارے گھر میں پار ڈال کر ہمیں غلام و خنجر کر لیتی تو ہمیں بالکل تعجب نہ ہوتا اور ہم بلا تکلف و بے حدی شروع کر دیتے۔

سنگل سنٹر میں پہنچے تو وہ جو احرام انسانیت کی افواہیں تھیں، سچ سچ درست نظر آنے لگیں۔ تمام استاد ادب سے پیش آئے، لیکن چھ ماہ کی حوا تر بے ادبی کے بعد ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھی قابل ادب قسم کے آدمی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری تعلیم ہمیں جعلی سی لگتی تھی۔ ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی جیسی نظام ستے کی اپنی مختصر سی جلالت مکی کے دور میں ہوتی ہوگی۔ شاید ہماری حالت زار نظام سے بھی کچھ تلی تھی، لیکن اسے اپنا انجام معلوم تھا اور ہمیں اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ فالتو احرام واقعی کوئی دریا چڑ ہے یا کسی وقت بھی موڈب انسٹرکٹر ایک ہلاکوانہ قندہ لگا کر ہمیں ٹریا سے کھینچ کر زمین پر دے ماریں گے اور پھر ہم ہوں گے اور ایک شہر اڑل! لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ اس احرام میں ملاوٹ نہ تھی اور یہ کہ ہمیں مہرجے کا احساس قصداً دلایا جا رہا تھا۔ وہی احساس جو لوئی ایس میں ہمارے دماغ سے نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس وقت کہ ہم نامزد تازہ شہری زندگی سے فوج میں تھے تھے وہی سچ تھا اور اب کہ افسری کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ہمیں افسرانہ انداز سکھائے جا رہے تھے۔

لیکن ہم اپنے استادوں کی نسبت اپنے انگریز ہم جماعتوں سے وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو زندگی بھر نہ سیکھا تھا۔ جماعت میں ہم میں کیڈٹ تھے، دس دسکی انگریز، ایک انگریز ہندوستان میں انگریزی فرموں کے ملازم تھے اور جبری بھرتی کے قانون کے تحت تربیت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یوں تو ہم سب برابر تھے، لیکن جماعت میں ان انگریز طلباء کا کاروبار ہم دیکھیں سے بہت مختلف تھا۔ وہ جماعت میں استادوں کے ساتھ یوں پہلازم ہوتے، جیسے چائے پیچے ہوئے دوستوں کے ساتھ گفتگو کر رہے ہوں، ادب ضرور کرتے لیکن خوف نہ کھاتے۔ ان سے کوئی انسٹرکٹر سوال پوچھتا تو جواب دینے سے پہلے آرام سے پائپ کا کش لگاتے، پھر

اسے ڈسک پر رکھتے اور پھر کرسی پر ڈرائیم دراز ہو کر جواب دیتے اور اس انداز سے کہ اگر درست ہے تو خیر، اگر نہیں بھی تو کوئی حرج نہیں کہ یہی ہمارا نقطہ نگاہ ہے۔

یہ خلاف اس کے ہم دیکھیں کے دل میں ہر وقت چورسا رہتا۔ جواب آتا تو جواب دینے میں بے تابی، اگر نہ آتا تو احساس جرم اور چھپنے کی کوشش۔ ان لوگوں کی خود اجمادی اور پختگی ان کے کردار کا حصہ تھی اور یہ غالباً ان کی ابتدائی تعلیم کا فیض تھا۔ ہمارا احساس کمتری ہماری اپنی ابتدائی تعلیم کا علیہ تھا۔ وہی تعلیم جس میں شاگردوں کو مرعیاننا استاد کی بہترین Teaching Aid یعنی درسی امداد ہے۔ یہ کہنا بہا ہے کہ ہمارے لئے نئی چیزیں سیکھنا اتنا ضرور تھا جتنا پرانی عادتیں بھلا دینا۔ اور ہم میں سے وہ جو ایسا نہ کر سکے، سینئر عملدوں پر پہنچ کر بھی تاباں نہیں رہے۔ یہ نہیں کہ انگریزوں میں جلائق یا کچھ نہیں ہوتے۔ کئی ایک کا ذکر آئے گا بھی، لیکن یہ سچ ہے کہ صرف ڈچین ہونا ہی کافی نہیں، کچھ شخصیت ہونا چاہئے، کچھ کردار ہونا چاہئے اور وہ جو اقبال نے کہا ہے کچھ محفل میں بات کرنے کا شعور ہونا چاہئے۔ سچ ہے کہ ان معاملات میں ہم ان انگریز دوستوں کو بتائے بغیر ان کی شاگردی کر رہے تھے اور مرعیانے بغیر وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو کتب کی خاکبازی میں نہ سیکھ پائے تھے۔

ذکر سنگل سنٹر کی زندگی کا تھا۔ اس زندگی میں آسائش تھی لیکن خدا جانے کیا وجہ تھی کہ وہ لطف نہ آ رہا تھا جو درشتی اور مشقت کے باوجود او'ٹی' ایس کی زندگی میں تھا۔ جب اس مسئلے کو انداز سے جھانک کر دیکھا تو ہم پر روشن ہوا کہ درشتی اور مشقت ہی تو لطف کا منبع تھے

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لیکن سنگل سنٹر کی زندگی فقط اللہ ہو کے گرد ہی نہیں گھومتی تھی۔ جمال ارجن سنگھ ایسے ہم جماعت ہوں وہاں کئی ایسے واقعات ناگزیر تھے جو دل بڑواں میں بھی کھٹکتے لگیں۔ ارجن سنگھ ایک قوی پیکل اور خوش مزاج سنگھ کیڈٹ تھا۔ پتا اس کی کمزوری تھی، ایک شام ارجن سنگھ کو معمول سے زیادہ بدست پایا گیا۔ حالانکہ اس روز میں میں ارجن سنگھ نے شراب کو چھوا تک نہ تھا۔ دوسرے روز نکلا اس میں بھی ارجن سنگھ معمول سے زیادہ موم میں

کے ہوئے چل نکلتے ہیں۔ اگر کسی سے ذرا آنکھ لڑ جاتی ہے تو نہایت چا بکدستی سے جوابی آنکھ مارتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ ارجن سنگھ کا بھرا سر کنٹر اٹھائے ان کے پیچھے بچے رواں ہے۔ ہرے سے پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کنسٹر کی منزل کرل ماحول کا بنگہ ہے۔

یہ سنگھل سنسٹر کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ کام کی بھی کمی نہ تھی تاہم ظاہر تھا کہ اس ماحول میں وہ لاٹنی ایس کے دنوں کے خود کشی کے منصوبے تھکا ہے جاہیں بلکہ یہاں کچھ اس تیزی سے نکلتے گئے کہ ایک دن نقشبتی کا حکم آگیا اور آنا "قاتا" ہمارے شانے پھولوں سے جھونکا گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد بالکل ایک پھول فی شانہ ہی تھی۔

اب ہمیں آنے والی دھمکی سے عجیب کیف محسوس ہو رہا تھا۔ کورس کے خاتمے سے چند روز پیشتر پوسٹنگ کے سلسلے میں ہم اپنے مرفوب شیش پوچھے گئے۔ ہمارا انتخاب بالترتیب لاہور اور پشاور تھا۔ لاہور آنے کا ہمیں خاص شوق تھا کہ جس دیار کے کوچوں کی ہم نے ایک گھم گھم عالم کی حیثیت سے جاک چمائی تھی اب اسی خاک کو افسرانہ شان سے دیکھنا چاہتے تھے۔ جب پوسٹنگ کا حکم پہنچا ہوا تو ہمارا تقرر پشاور ڈسٹرکٹ سیکرٹری میں ہوا۔ لاہور نہ ملنے پر مایوسی تو ہوئی لیکن قیامت برداشت سی پشاور کی ایک خوبی تو ظاہر تھی کہ ہمارے لئے نئی جگہ تھی۔ علاوہ ازیں جب اپنے پٹھان دوستوں سے پشاور چھاؤنی کی دلچسپیوں اور پشاور کلب کی ریگبی ٹیموں کے چرچے سنے تو نہایت بے تابی سے رخت ستر باندھا۔

تھاکر اور کلاس کے رستے میں کوئی میکانہ بھی نہ پڑتا تھا۔ ہمارے ایک انگریز ساتھی نے شرارتاً کہہ دیا کہ ارجن سنگھ نمبو پانی پر ہی ٹائٹ ہو گیا ہے۔ ارجن سنگھ اس صحت پر بزرگ نہ انداز میں مسکرا دیا۔ شام ہوئی تو ارجن سنگھ کی مستی علاج پر تھی۔ دفعتاً اپنے کمرے سے نکلا اور ایک دوسرے کیڈٹ کی کمر میں بازو ڈال کر ٹپنے لگا۔ معافیہ تھا کہ ارجن سنگھ آخر کیا پی رہا ہے جو دو روز سے ہوش میں نہیں آتا؟ رقص جاری تھا کہ ہمارے کمان افسر یعنی کرل صاحب اوجھر آ گئے۔ دراصل وہ بھی ارجن سنگھ کی مستی کا عقدہ حل کرنے کی فکر میں تھے۔ ارجن سنگھ نے انہیں دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "بڑھا اور کرل صاحب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ٹپنے کی ابتدا کر لے گا" لیکن کرل صاحب نے مسکرا کر کہا:

"ارجن سنگھ! ہمیں گے بعد میں" تو ذرا تسارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔

ارجن سنگھ بخوشی راضی ہو گیا۔ بدستور کرل صاحب کی کمر میں بازو ڈالے انہیں کمرے میں لے گیا اور حسب دستور پوچھا کہ کچھ نہیں ہے؟ کرل صاحب بھی تو معلوم کرنا چاہتے تھے "چنانچہ انگریزوں کا وہ روایتی فقرہ بولے۔ "I Would Love It" اس پر ارجن سنگھ اٹھا اپنا چنگ لٹایا۔ نیچے دو کنسٹر کی شراب کے پڑے تھے۔ ارجن سنگھ نے ایک پر سے ڈھکا اٹھایا اور ایک لمبا گلاس لبالب بھر کر کرل صاحب کو پیش کیا۔ کرل صاحب ذرا جھجکے تو ارجن سنگھ بولا:

"چمک جاؤ موتیاں والیو۔ آؤ دیکھی اے" آپاں گھر بنا دے ہاں۔"

کرل صاحب کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا "البتہ انہوں نے ارجن سنگھ کی خوشنودی کے لئے گلاس منہ سے لگا لیا۔ خدا جانے ارجن سنگھ کی خانہ ساز میں کیا تاثیر تھی کہ کرل صاحب ایک دفعہ گلاس کو ہونٹوں سے لگانے کے بعد جدانہ کر سکے اور پورا گلاس حلق میں اندر لیا۔ راوی یعنی ارجن سنگھ کے ہرے کا کہنا ہے کہ کرل صاحب نے دو سرا گلاس اپنے ہاتھوں سے بھرا اور چڑھا گئے۔ کوئی آدھا گھنٹہ بعد جو نظارہ ہم باہر کھڑے ہوئے تماشاہیوں نے دیکھا۔ یہ تھا: کیڈٹ ارجن سنگھ اور کرل صاحب اپنے ہاتھوں میں جام شراب تھامے اور بازو ایک دوسرے کے گلے میں محاسن کے قہرکتے قہرکتے کمرے سے باہر آتے ہیں اور ہم سے قطع نظر

## نیم لفظیں پشاور میں

ایرلینڈ کی وہ صبح جو لے کی تھی، بس وہ چھوٹی ریل گاڑی ہم نیم لفظیوں کی ہفتی کاٹی لائی کو لے کے شیش سے اٹھی۔ معاہدہ میں وہ دن یاد آیا جب نو ماہ پہنچے ہم اسی شیش پر پہلی مرتبہ اترے تھے اور گورے سارے شیشوں نے ہمارے پنداری گرہ کا ردِ اول ہی کام تمام کر دیا تھا، لیکن وہی گورے آج ہمیں سیونوں سے رخصت کر رہے تھے۔ ہمارا مورال اس بلندی پر بھی نہ پہنچا تھا اب ہمیں کسی سے شک نہ تھا نہ شکوہ، دنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ صوبہ کے وہ مضافات بھی چلتی گاڑی سے دلفریب نظر آ رہے تھے جن سے چند ملک قسم کی فوجی مشینوں کی یاد وابستہ تھی۔ جیسا پہاڑی تو ہمیں واوی گنگا کی طرح محبت کے اشارے کر رہی تھی۔

درازی سفر میں ہم نے افسرانہ مستقبل کے لئے جو منصوبے بنائے وہ زیادہ تر ہمیں 'کلب'، 'مینگ' سواری اور یو نیفارم وغیرہ کے متعلق تھے۔ یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ میں اس وقت ایک عالمگیر جنگ بھی جاری تھی جو ہمارے وطن تک اگرچہ نہیں پہنچی تھی، تاہم ہمارے بزاروں ہم وطن اس تک پہنچ چکے تھے اور کئی سردھڑکی بازی بھی لگا چکے تھے اور یہ کہ خود ہمیں بھی کچھ اسی مقصد کے لئے تیار کیا گیا تھا، لیکن فی الحال ہم لڑائی سے مختلف سمت میں جا رہے تھے اور جنگ کا خیال قطعاً بے جا تھا۔ البتہ ہمارے ایک پشاور سیاحتی محاذ جنگ



پر نہ بھیجے جانے کی وجہ سے خاصے افسر وہ تھے، بلکہ ٹریننگ کے دنوں میں ہی جب ایک دن کسی مضمون میں قتل ہوئے پر ان سے باز پرس ہوئی تو انہوں نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا: "ہم قتل میل کچھ نہیں جانتے۔ ہم بنیا نہیں جو سوال نکالے، ہم کو لڑائی میں بھیجو، ہم بادشاہ کی خدمت کرنے آیا ہے۔"

دراصل ہمارے دوست کو تکلیف یہ تھی کہ ان کے گھر میں ایک ڈھال اور ایک کھوار رکھی تھی اور یہ تاریخی اسلحہ ان کی خاندان کی روایات کے مطابق بانی خاندان کے ہاتھوں میں آیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا تعین نہیں ہو سکا تھا کہ یہ واقعہ سکندر کے حملے سے پہلے تصور میں آیا تھا یا بعد میں، لیکن ہر حال یہ اس امر کی صریح علامت تھی کہ آپ ایک مارشل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چنانچہ آپ کی پہلی گری کے اس تہنکاپ پس منظر میں آپ کو یہ کسی صورت کو ارا نہ تھا کہ حسن اتفاق سے جنگ جاری ہو (یعنی خدا نے ان کے لئے داو شجاعت دینے کے تمام اسباب پیدا کر رکھے ہوں) اور وہ آپ کی زندگی میں ہی دارالامان کو پہنچ سکے جائیں۔ چنانچہ تمام راستے ان کا مارشل خون کھول دیا اور ہم سے الگ حصے میں Warlike Store بنے بیٹھے رہے۔

موسے پشاور تک سب ساتھی درمیانی نشینوں پر اتر گئے اور گاڑی سرشام پشاور پہنچی۔ ہمارے استقبال کے لئے دو افسر موجود تھے۔ دونوں انگریز ان دنوں کچھ افسر ابھی گنتی کے تھے۔ دہلی افسروں کی تحوکہ بھرتی کسی قدر بعد میں شروع ہوئی۔ جب جاپان کے جنگ میں کود کر آگ سی لگا دی اور وہی نشینی جو ہم نے خون جگر سے حاصل کی تھی، سر راہ بننے لگی۔ اب استقبال کو تو یہ دو انگریز آگئے تھے، لیکن ان کا طرزِ تپاک کچھ ایسا تھا جسے دیکھ کر دل جل تو نہ گیا، لیکن مجلس ضرور گیا۔ پہلی سی مزاج پر سی اور بس۔ پھر کار میں بٹھا کر ہمیں خارج از بحث سمجھ کر گھسے ہاتھ لگے۔ گویا کھجلی سیٹ پر انسان نہیں بہتر رکھا ہے۔

سکھل آفیسر میں بیٹھے تو ہمیں اپنا کوارڈر دکھایا گیا۔ ایک امیدوار بیرا شیراز پہلے ہی سے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آنے والا صاحب بے بیرا ہو تو شامل خدمت ہو جائے۔ ایسا ہی ہوا وقت کم تھا ہم نے ڈنر کے لئے کپڑے بدلے۔ چونکہ میں نے جانے کے لئے پہلی شب کا

معاملہ تھا، اپنی "ٹرن آؤٹ" کی نوک پلک خاص طور پر سنواری اور اس سلسلہ میں شیراز کے ماہرانہ مشوروں سے استفادہ کیا کہ وہ مقامی رسوم سے باخبر تھا اور سالہا سال کی بیرا توپ کے خفیل ان معاملات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔

میں میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ بے تابی میں سب سے پہلے آگئے ہیں۔ انہی روم کے زبائشی مسلمان کو دیکھنا شروع کیا۔ پاس ریڈیو پڑا تھا۔ ایک سکھل افسر کو کہیں ریڈیو نظر آجائے تو بھول گئے اسے چمیزنے کا "پنچ" ضرور لیتا ہے۔ ہم نے بھی لیا۔ سوئی اتھاٹا لاہور کے شیش پر جاری جہاں کچھ کوئی غیرت ناہید ڈھولک کا گیت گا رہی تھی "چلی دے تھلے برہ" کے "ہم اس کے شعلے کی لپک میں تھم گئے اور میں دمانیہ سے غافل ہو کر پاس کے صوفے پر بیٹھ کر سننے لگے نا آنگہ باہر سے بیک وقت دو چار انگریزی آوازیں بلند ہوئیں اور متفقہ طور پر اس گستاخ کے ہم اور سر کا مطالبہ کیا جو یہ نشانہ موسیقی سننے کا ارتکاب کر رہا تھا۔

یہ سن کر انگریز افسر تھکے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس انگریز کدے میں دہلی گانا ایک باغیانہ فعل سمجھتے تھے۔ وہ ابھی باہری شور مچا رہے تھے میں نے سوچا کہ پونٹ میں پسلان ہے۔ اپنے حلق اولیں تاثرات خراب کرنا قرین مصلحت نہیں، لہذا ریڈیو بند کر دیا۔ لیکن کسی اندرونی آواز نے مشورہ دیا کہ ریڈیو بند کر کے تم ان کی خوشنودی تو شاید حاصل کر سکو گے یا نہیں، البتہ اپنی بڑی کا خاصا پلٹے ثبوت دو گے۔ چنانچہ ریڈیو کو لگا رہے دیا، لیکن اب محرم موسیقی کی وجہ سے میں، بلکہ تحفہ ہاسوس کی خاطر۔

انگریز افسروں کا خیال تھا کہ کسی نوکر نے میں غالی دیکھ کر گانا گارکھا ہے۔ لیکن جب اندر داخل ہوئے اور مجھے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھا تو سمجھے کہ سچ گند کی ابتدا ہو رہی ہے۔ ذرا رکے اور پھر ان میں جو اچھا بڑا کاسب سے بڑا فداائی تھا، بڑھا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "خبریں نہ سنو گے؟" اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سوئی تھما کر بی بی سی پر کردی۔ اتفاق سے اس وقت خبریں بھی شروع تھیں، چنانچہ میں خاموش رہا۔

میں اس میں کووارڈ تھا، لیکن کسی نے مجھ سے مصافحہ تک نہ کیا۔ ظاہر تھا کہ ٹرانسٹ سی، لیکن تصور ہم نے معرکے کا کیا ہے، جسے انگریزوں کی آنکھ نہیں سمجھتی، مگر



ایک ویسی کانگریز کی خاطر لڑنا احسان سمجھتا تھا۔ یہ نشست وائٹ تھا۔ جان وائٹ کی ملاقات اس شب کے ناگوار حادثوں کے بعد منہ میں گویا بیٹھا زائچہ چھوڑ گئی۔

دوسرے دن کمان افسر سے ملاقات ہوئی۔ خیال تھا رات کی گفتگو کی صفائی طلب کریں گے، لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ایڈجوٹ صاحب نے البتہ اعلان جنگ واپس نہیں لیا تھا۔ وائٹ ہمیں نہیں کریں کہ ہمیں اپنے نئے فرائض کے متعلق حکم سنایا اور تیار ہوا ہم ایک ایسے سیکشن کے افسر یا فوجی زبان میں اوسی (o.c.) مقرر ہوئے جس کا کام پہاڑی توپ خانے کی تعمیر و اصلاحات بہم پہنچانا تھا۔

اس سیکشن میں انسان تھوڑے تھے اور گھوڑے اور خچر زیادہ۔ طبیعت پہلے تو کچھ برہم ہوئی، لیکن جب میں اپنے سیکشن میں پہنچا اور ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تو ایمان تازہ ہو گیا۔ یہ سیکشن تمام تر پنجابی مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یہ سن کر ایک ویسی افسر پہلی دفعہ اوسی مقرر ہوا ہے، ان لوگوں نے اس غلطی سے بڑا خیر مقدم کیا کہ میں کانگریزوں کی رنجش بھول گیا۔ سینئر عہدیداروں نے کمانڈر شرفی سے مجھے سیکشن کا مسلمان دکھایا اور جوانوں کے علاوہ تمام گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ جی ہاں، ان سب کے اپنے اپنے نام تھے، اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی خصوصیتیں، اس پہلی ملاقات پر سیکشن کے لوگ جس محبت کا اظہار کر رہے تھے وہ خود اس سے کہیں زیادہ محبت کئے جانے کے قابل تھے اور میرے دل میں یہ عمدہ مستحکم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی توقعات کو کبھی تشنہ نہ رہنے دوں گا۔

اس شام جب میں میس میں گیا تو کانگریز اگرچہ بدستور کچے کچے تھے لیکن میرے دل میں ایک ایسا اطمینان تھا جسے کانگریزوں کی ناراضگی نہیں چھین سکتی تھی اور ہمارا معاملہ ایسا مکمل بھی نہ تھا۔ جان وائٹ ہم سے غیر معمولی تپاک سے بغلیں ہوئے اور ریڈیو کی طرف اشارہ کر کے بولے: ”ذرا اپنے ملک کا گانا تو سناؤ۔“ پھر جس کرتابا کہ آج دن بھر تمہارے پنجابی گانا سننے اور پرس رائل کی تصویر کو نہ پہچاننے کے متعلق بحث ہوتی رہی۔ سار جٹ لوگوں نے تو تمہارے خلاف کمان افسر تک شکایت پہنچادی، لیکن الٹی ان کو تنبیہ ہوئی۔ میں نے پوچھا: ”سار جٹ لوگ کون؟“ تو کہنے لگا: ”میری تم سے لڑنے والے افسر یہ سب پہلے

کریں گی۔ بعد میں دوسرے افسر آئے۔ وہ بھی کانگریز تھے، لیکن انہیں ہماری بغاوت کا علم نہ تھا۔ ان میں سے ایک جو سیکشن سے ہمیں ساتھ لایا تھا اور ایڈجوٹ تھا، ہمارے صوفے پر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ میں نے میں اور اس کی آرائش کی تعریف کی۔ اتفاق سے سامنے ایک عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ میں نے پوچھا۔

”یہ عورت کون ہے؟“

میرا یہ کہنا تھا کہ ایڈجوٹ صاحب کا رنگ بدل گیا اور مجھے ایک عجیب سی آنکھ کے قمر کے عالم میں گھورتے ہوئے بولے۔

”عورت؟ خدا کے بندے یہ محض عورت نہیں پرس رائل ہے، تمہاری شکل کور کی کر عکس کمانڈر انٹ، تم واقعی شکل ہو؟“

اب یہ واقعہ ہے کہ مجھے شراوی موصوف کے کورس کمانڈر انٹ ہونے کا علم اور فخر ضرور تھا، لیکن یہ کہ سامنے والی تصویر ان ہی کی تھی، اس کا مجھے علم نہ تھا۔ ایسے حالات میں کانگریزوں میں معذرت کا ایک معروف فقرہ چڑھایا جاتا ہے اور سارا گلہ دھل جاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی عمل کیا، لیکن گلہ دھلنا تو کیا، اس کانگریز کے چہرے پر ہنس اور تھوڑی نوع کی علامات پیدا ہونے لگیں اور ان آثار کے زائل کرنے کا طریقہ ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ ناچار چپ ہو کر بیٹھ گیا۔

ہمارے لئے پونٹ کی ابتدا یقیناً اچھی نہیں ہوئی تھی، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا دل کو سمجھایا کہ دیکھو میاں! اس ملک میں جب تک ہمارا واسطہ کانگریزوں سے ہے، کوہاں تو ہو گا۔ باقی رہیں میس کی پہلی رات کی وارداتیں، تو ان سے پریشان ہونا نفس کی شان نہیں، میس کے باہر بھی بیسیوں کام ہیں ان میں قابلیت کا سکہ بٹھایا جاسکتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل جڑ بھی سکتے ہیں۔۔۔ ویسے اس شب کمانے کے دوران ان کے جڑنے کا کوئی امکان نظر نہ آیا، بلکہ ایک پلیٹ ہمارے ہاتھ سے ٹوٹنے لگتی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریڈیو ’تصویروں‘ پلیٹوں غرض ہر چیز نے ہمارے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ فقط ایک شخص جو باتیں جانب میز پر بٹھا تھا، ہم سے کسی قدر گرم جوشی سے باتیں کرتا رہا۔ وہ ولایت سے تازہ آیا تھا اور

لے جانے کی اجازت ہوتی ہے چنانچہ شیربازہ ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنے بکنی انگریز صاحبوں کے ساتھ سرحدی معرکوں میں شریک ہو چکا تھا۔ عام لوگوں کو علم نہیں کہ ان سرحدی لڑائیوں میں بھی دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ شیربازہ سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کا ایک انگریز صاحب قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دوکان والہس ملے تھے۔ ہمارے اطمینان کے لئے شیربازہ نے اتنا اضافہ کیا کہ ”تم فکر مت کرو وہ مسلمان کالا لاش خراب نہیں کرتے۔“

اور حریفانہ اور گاڑی بنوں کو روانہ ہوئی۔

UrduPhoto.com

سار جٹ تھے اور اگر لڑائی نہ چھڑتی تو اس وقت بھی سار جٹ ہی ہوتے۔ ”بہر کیف ہم نے کسی قدر قاتلانہ انداز سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ انتہائی جذبے پر قابو پا کر ریڈیو کو تو نہ چھیڑا لیکن جان وائٹ کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر منہ سے ماسیہ کی ایک کلی منگنا دی اور جان نے اپنی حمسین کے اگھار کے لئے والمانہ تلی بجا دی۔

وائٹ سے اب ہماری گاڑی چھٹنے لگی۔ دوسرے انگریزوں سے بھی ہمیں تو کچھ ہیر نہ تھا البتہ وہ ذرا غصا سے تھے اور وائٹ کی حرکتیں اس فحشگی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔ وائٹ دراصل ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان تھا۔ کیمبرج سے تعلیم اور مری چھوڑ کر آیا تھا۔ اسے اپنے منظر کا خاص طور پر خیال تھا اور باقی انگریزوں کی نسبت اہتمام سے نظرت کا اگھار کرتا تھا۔ کیونکہ ان کی زبان اور منظر امریکی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ ان کے پاس فقط دس بارہ جوش مکرچست اور چاقو سے الفاظ تھے جن سے وہ اپنا تمام ترمانی انصیر ادا کرتے تھے۔ یہ الفاظ کسی ڈکشنری میں نہیں ہوتے یہ صرف سار جٹ لوگوں کے یہاں سینہ بہ سینہ چلا کرتے ہیں۔ وائٹ بھی اپنی زبان بے شک بچری آئینہ دار تھی لیکن جو پٹھارا سار بنشوں کی مرصع زبان میں تھا اس سے بھی اگھار حاصل ہے۔

یونٹ میں کوئی چند روز گزرے تھے کہ اچانک ہمارے کمان افسر کا چہرہ ہو گیا۔ ان کا جانا تھا کہ ہمیں ایڈ جوتھ نے طلب کیا اور حکم دیا:

”تم آج افکارہ سو بجے (یعنی شام چھ بجے) کی گاڑی سے لوگوں چلو گے اور وہاں سے آگے نوپنی کالم میں جا کر شامل ہو گے جو اس وقت فقیرا یہی کے خلاف وزیرستان میں دہشت گردوں کے مقام پر مصروف جنگ ہے۔ وہاں تم فٹسٹ ٹیم کو قاریخ کرو گے۔“

جب وائٹ کو ہمارے چار لے کالم جو اتو بھاگا بھاگا آیا اور یولا:

”یہ ٹیم بھی سار جٹ ہے۔ اس کے نہ ہونے سے ان لوگوں کی برج کی چوڑی نامکمل تھی۔ صرف کمان افسر کے کہنے پر حمسین یہاں رکھا گیا تھا ورنہ پہلے ہی دن فقیرا یہی کی خدمت میں بھیج دیے جاتے۔“

افکارہ سو بجے ہم بنوں جانے والی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ فرنیئر کی لڑائیوں میں ہیرا ساتھ

1- Moralہ مرسلے اور نور احمدی کے لئے فوج کا سکند بننا تھا

2- سلمان جنگ کے لئے فوجی اصطلاح

3- یہ فوجی اکابر تھے حاصل ہے۔

4- باجالی فوج ہے مطلب ہے فوج کو دور کام کرنا نہ نشان کا پامٹ ہو۔

## کوہستان جنگ

تیرے سر پر ہونے ہمیں انگریزوں کے مقابلے میں رعایت تو کافی دی تھی کہ مرنے کے بعد  
ہمارے کانوں کی بے حرکتی نہیں کی جائے گی، لیکن قبائلیوں کی اس اسلامی رواداری کے  
باوجود ہمیں زندہ رہنا کچھ بہتری معلوم ہوتا تھا۔ یوں بھی ہمیں ایک انگریز کو برج کے لئے  
قارع کرنے کو بھیجا جا رہا تھا۔ کوئی ضمانت کا معاملہ تو تھا نہیں کہ ہم گاڑی میں داخل ہوتے ہی  
سرکٹ ہو جائے، چنانچہ بالکل مائع آدمیوں کی طرح سر کیا۔ عام آدمیوں کی طرح پیچھے والوں  
کو ہوسا اور رات کو وہی متوقع خواب دیکھے کہ کان غائب ہیں۔

دو سرے روز بنوں ٹرانزٹ سٹپ میں پہنچے۔ منزل مقصود تو میرا شاہ سے آگے وناخیل  
تھی جہاں ہمارا لیڈ (نوجی کالم) فقیراچی سے لڑنے کے لئے بڑھ رہا تھا۔ لیکن بنوں پہنچ  
کر معلوم ہوا کہ آگے جانے کے لئے R.O.D. یعنی سڑک کھلنے کے دن کا انتظار کرنا پڑے گا  
جو جیتے میں ایک آدھ مرتبہ تھا۔ اس وقفے میں شیربازہ کو اتفاقاً علم ہو گیا کہ ہمیں چالاکی سے ہم  
کی جگہ بھیجا جا رہا ہے۔ شیربازہ اس پرست پر ہم ہوا۔ مجھے پشتم نہیں آتی تھی، لیکن ہم کے حق  
میں جو غاردار سی پشتم اس کے منہ سے نکلی، ظاہر تھا کہ قصیدے کی قسم کی چیز نہیں، البتہ اردو  
میں شیربازہ نے ہمیں اتنا کہا کہ "صاحب آپ کے ساتھ ٹھکی (ٹھکی) ہو گیا ہے، ہم اس کا علاج  
کرے گا اور تم کو واپس پٹنور بھیجے گا۔" (پٹنور بھیجے گا)

عبادت میں غفل واقع نہ ہو، آپ کو شکم پری سے خاص طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ آپ کے رشتہ دار یا حکومت آپ کو روپوں میں تول کر واپس لے جاتی ہے یا بھڑوی گوش تراشی کی نوبت آتی ہے۔

آر۔ او۔ ڈی ایسے امتزاعات کا جواب تھا جس روز قبائلی علاقے کی سڑکوں سے کسی رسد کے کانوائے یا فوج کے کالم کو گزرنا ہو تھا، سڑک کے دونوں طرف پٹائیوں کی چوٹیوں پر ہماری فوج چوکیاں جماتی تھی تاکہ سڑکوں پر آمد و رفت بغیر امتزاض جاری رہے، بھانڈو دستوں کے لئے چوکیوں پر بیٹھا کوئی پلٹک کی قسم کی چیز نہ تھی کیونکہ دوسروں کی نسبت یہ لوگ معتزین کی گولیاں اور گھڑوں سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والے اگرچہ محفوظ ہوتے تھے۔ لیکن ان کے منہ کا زائچہ بدلنے کے لئے بھی اکا دکا گولی کہیں سے آتی تھتی تھی۔

ہمارا کانوائے روانہ ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف حفاظتی دستے اور بکتر بند گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر سڑکوں اور شاہیہ کے لوگ تھے جن کے انگریز افسروں نے موزی کی شلواریں پہن رکھی تھیں اور سر پر کچھ دار پگڑیاں تھیں، کیونکہ اس علاقے میں کسی سر کا انگریزی ہیٹ کے نیچے سلامت رہنا کسی قدر غیر یقینی تھا۔

میراں شاہ، جو ہمارا بریگڈ فروکش تھا، اپنے توہم پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اونچا، کالا اور لمبی مونچھوں والا، بالکل نام لیکن نہایت خوش مزاج، مجھے دیکھتے ہی بولا:

"تو ان بد معاشوں نے حمیس ہرج کی خاطر نکال مارا ہے۔ تمہارا اپنا قصور ہے حمیس ہرج آنا چاہئے تھی۔"

ہم کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ تواضع کے بعد اس نے حسب معمول اپنے یکیشن کے جوانوں، گھوڑوں اور گھڑوں سے تعارف کرایا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سرنگ گھوڑے کے متعلق نام کے تعارفی الفاظ سے خاصے لرزہ خیز تھے اور مجھے اس سے ذرا دور سے ہی مزاج پرسی کی ہدایت کی گئی۔ اس گھوڑے کا نمبر ۲۲ تھا۔

یہ تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ شیراز فوجی اس رات کے لئے اس نام سے کھانے کے لئے میں کو جانے لگا تو شیراز ایک نئے کہاؤں سے لبرز پیٹ کے لکڑا، کسی انگریزی میں کے رستے میں ایک دسی افسر کے لئے نئے کہاؤں سے بہتر کوئی روڈ بلاک نہیں، چنانچہ اس رات ہم میں سے غیر حاضر رہے۔ اس کے بعد شیراز نے ہر کھانے سے پہلے نئے کہاؤں کھانے کا معمول بنالیا۔ اسی طرح ہفتہ گزر گیا اور سڑک کھلنے کا دن آیا۔ صبح کانوائے جاتا تھا۔ رات شیراز آیا تو میں نے کہا:

"شیراز! وہ ہفتادہ کی واپسی کیا ہوئی؟"

شیراز کسی قدر جھنجھلا کر بولا:

"ہم نے تم کو اتنا کہا کہ کھانا (کھلایا) خود تم بناؤ ڈی نہیں ہو تے۔" شیراز کی سکیم کا اندازہ مجھے پہلا تھا کھا کر ہی ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے اسی حد تک زبان درازی کی تھی جو باعث فساد نہ ہو۔

اگلے روز صبح ہمارا کانوائے روانہ ہوا اور ہم پر پہلی مرتبہ آر او ڈی کے اسرار قاش ہوئے۔ واقعہ یوں ہے کہ ان دنوں قبائلی علاقے میں سڑکوں سے پہلے قبائلیوں کے چھ امتزاعات رفع کرنا پڑتے تھے۔ بد قسمتی سے یہ لوگ اپنے امتزاعات کے اظہار میں ربانی فصاحت یا بلاغت کے قائل نہ تھے، بلکہ سرے سے زبان کا استعمال ہی نہ کرتے تھے مثلاً آپ موٹر میں جا رہے ہیں اور اچانک کہیں سے ایک گولی آپ کے بازو میں بطور امتزاض آگئی ہے یا پلٹے پلٹے اپنے رستے میں پل غائب پاتے ہیں اور دو چار ذرا خود کو گھوم کر جسم کے معتزین آپ کے استقبال کے لئے آوارہ ہوتے ہیں جو بلا تکلف آپ کو موٹر سے نکال کر آپ کا ہاتھ پکڑے اور کپڑوں کا بوجھ ہٹا کر دیتے ہیں۔ آپ میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر لیتے ہیں اور اس کے لئے آپ سے کچھ درخواست بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ پھر اگر آپ ہندو ہیں تو فی الفور آپ کی ہمتی اور نردان کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور اگر مسلمان ہیں تو آپ کو صوم و صلوٰۃ کی مسلسل آسانی، بچہ پنپانے کے لئے ایک غار مینا کیا جاتا ہے۔ جہاں صوم کا ثواب تو زیادہ تر میرزاں ہی کو پہنچتا ہے۔ البتہ صلوٰۃ کا اجر آپ کی اپنی چیز ہے۔ اس خیال سے کہ آپ کی



طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ہمارے بریگڈ نے پوسٹ کے قریب ایک وسیع دائرے میں ڈیرے ڈالے۔ دائرے کی مختلف قوسوں میں ایک معروف قلعہ کے مطابق مختلف پونٹوں کی جگہ دی گئی اور دائرے کے ارد گرد جو پست قدی حفاظتی دیوار تھی اس کی مرمت کی گئی۔ اب اگلے روز فقیر اسی کے خلاف جنگ آزما ہوتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب چارو ناچار ایک دو روز میں جاں بحق ہو جائیں گے۔

سرحدی جنگوں کا انداز کچھ ترالا سا ہوتا ہے۔ ہر روز ایک معرکہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی لشکر کے قلعے ہونے کی خبر سننے تو اس کی کوٹھالی کے لئے جاتے۔ کبھی دشمن کے گاؤں کو گھیرے میں لے کر اس کے مکان اور برج تباہ کرتے۔ کبھی سڑک بنانے کے لئے جاتے اور کبھی آراوڑی کے لئے۔

پہلے دن ایک لشکر کی چابی کے لئے منہ اندھیرے ہمارا کالم کیپ سے نکلا، دشمن 'رسالہ' توپ خانہ 'سب کے سب خاموش' خوف کا سا عالم۔ جاں بحق ہونے کا شدید احساس 'آخر میں ان کا رونا سننے کو پہنچے تو اپنے آپ کو چند دوسرے افسروں کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پایا۔ ہم سے ذرا نیچے ہماری پہلن اور توپ خانے نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔ اس سے نیچے جگہ تھا اور ٹالے سے پار کی پہاڑی پر دشمن تھا۔ فضا بدستور خاموش تھی۔ ہم اپنی دور بینوں سے دشمن کی حرکات دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ایک جگہ نہ بچا تھا۔ دغنا "سکوت ٹوٹا اور تڑپ مچ گئی۔"

یہ گویا قبائلی گولی کی Signatruetune تھی۔ جو دشمن کی کہیں گاہوں اور سمت کا اندازہ ہوا 'ہماری طرف سے دشمن کہیں دند ٹالے لگیں۔ توہیں گولے داغنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا دشمن صفحہ ہستی سے نابود ہو جائے گا، لیکن جو دشمن ہمارا قاتل بن رہا تھا وہی ٹھک ٹھک شرواع ہو گئی۔

ربا ہمارے جاں بحق ہونے کا سوال 'تو وہ کچھ پیدا نہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ اتفاق سے ہم اتنی بلندی اور فاصلے پر تھے کہ دشمن کی گولیوں کی زد سے باہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چٹانوں پر بغیر

ہم دوسرے روز سیکشن ہمارے حوالے کر کے پشاور چل دیا اور ہم اپنے بریگڈ کے ساتھ وٹاخیل کو روانہ ہوئے۔ وٹاخیل افغانستان کی سرحد کے قریب واقع ہے اور فقیر اسی کی جائے سکونت یعنی گرد پخت سے قریب ترین برطانوی پوسٹ تھی۔ فقیر اسی کا قریب حاصل کرنے کے لئے ہمیں پہل صراط کی قسم کے مقامات سے گزرنا پڑا۔ ہر چند کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوجیں سپرد رہی تھیں۔ تاہم سڑک کے بعض حصے ایسے قبائلی نشانہ بازوں کی زد میں تھے جو خود تو چٹانوں کی اوٹ میں ہماری گولیوں سے محفوظ تھے، لیکن ان کی گولیوں اور ہمارے سروں کے درمیان ہوا کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا جواب ہمارے پاس ایک ہی تھا کہ کلہ شریف پڑھیں۔ سڑک کا وہ حصہ نہایت تیزی سے عبور کریں اور باقی معاملہ خدا کے سپرد کر دیں۔ اس نکلنے کو عبور کرتے ہوئے ہم نے اچھے خاصے سنجیدہ بزرگوں میں سنجیدگی کی تمام علامتیں غائب ہوتے دیکھیں۔

مقام محل سے آسان گزر گیا اور مقام شوق میں کھو گیا وہ قرزان

البتہ وہ ٹکڑا عبور کرنے کے بعد ان میں تمام بزرگان حکمت عود کر آئی۔ ہم سے پہلے گزرنے والوں میں سے ایک دو آدمیوں کو گولی لگی 'پھر ہمارے سیکشن کی باری آئی جو پچیس تیس آدمیوں اور اتنے ہی جانوروں پر مشتمل تھا۔ اس نکلنے پر قدم رکھنے سے پہلے ٹانگہ حیات محمد نے دعا مانگی کہ "یا اللہ ہم سب کو بچا اور ہم سے قربانی نہ لے" ہے تو ہم گھوڑا نمبر ۲۲ پیش کرتے ہیں کیونکہ اس کا علاج کچھ تیزی ذات ہی کر سکتی ہے۔" معلوم ہوتا ہے ٹانگہ حیات محمد کی دعا اللہ تعالیٰ تک خط مستقیم میں جا پہنچی، کیونکہ چند منٹ بعد تمام سیکشن بخیر و عافیت پار تھا، سوائے گھوڑا نمبر ۲۲ کے جس نے سینے پر گولی کھا کر اپنی جان آفریں کے حوالے کر دی اور اپنے این سی او (NCO) کی لاج رکھ کر فوجی ضبط کی مثال قائم کر دی۔

وٹاخیل کی پوسٹ (چھوٹا قلعہ) ایک خاصے نکلے میدان میں واقع ہے جس کے چاروں

پھر وہ آرام سے سو گئے۔

اس کے بعد ہر روز سرشام پہاڑ کے کسی کونے سے مصرع طرح کے طور پر ایک قبائلی گولی آ نکلتی اور یہ شعر کوئی اس وقت تک جاری رہتی جب تک جواب میں ایک پوری غزل پیش نہ کر دی جاتی۔

ہم میں سے اکثر سامعین کے ذمے میں تھے اور اگرچہ باہر سے آنے والی گولی کا واجبی سا ذرا بھی رہتا تھا تاہم ہر شام کا تھا شاید ایسا جزو زندگی بن گیا تھا کہ کسی وجہ سے ٹانہ ہو جاتا تو ہمارے ہاں ہی ہوتی جیسے سینما ہال میں داخل ہونے پر فلم کی نمائش روک دی جائے۔ اسی قماشے کے طور پر ایک شام ہمارا ایک خوش مزاج اور کمزور مشق پھر رانی ملک عدم ہو گیا اور ہمارے بکشن میں ہم کی طرف سے گولی آ نکلتی۔ کیونکہ بقول ٹائیک حیات محمد "آجہا جانی کا" ٹیڈ کرافٹ کا علم اس قدر پختہ تھا کہ اس کا ایک قبائلی گولی کی زد میں آنا ہرگز نہ آتا تھا۔

لڑائی کے دنوں میں پو پو بیکل بیمار نمٹ کے ذریعہ دشمن سے نامہ و پیام بھی رہتا۔ بلکہ قبائلی روایات کے مطابق پانچ سات تین دنوں سے قبائل ٹھوڑیوں کے بچے سے بچیاں ہاندے اور سفید چادر میں تانے کیپ میں آجائش ہوتے "کالم کماڈر سے بات کرتے اور پھر اسی طرح سفید پھرے اڑاتے ہوئے تھوڑی کیپ سے باہر نکل جاتے۔ بات خفیہ ہوتی مگر ہم تک مع تفسیر لکڑی کی ٹیبلٹ میں آجائش کی قبائلی چند لاکھ روپے کے عوض صلح پر آمادہ ہیں یا وہ مزید ایک سال تک لے لڑنے کا بیڑ دے گئے ہیں۔

فرض دو ماہ تک یہی انداز رہا اور جس جنگ سے بچنے کے لئے شیرازہ میں نکلے کباب کھلا کر تیار کرنا چاہتا تھا وہ نہایت ہی صحت افزا ثابت ہوئی۔ خود شیرازہ کو اس زندگی سے عشق ہونے لگا جس میں اور چیزوں کے علاوہ مفت اور وا فر راش کا حصہ بھی تھا۔

جنگ اگرچہ اب ہفتے عشرے میں ختم ہونے والی تھی تاہم شیرازہ اور ہم ایک غیر صمیمین عرصے کے لئے جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ اتنے میں اچانک پشاور سے دائر لیس سے پیغام آیا:

"پشاور پہنچو تمہاری جگہ پھر نام آ رہا ہے۔"

اوٹ کے بیٹھے 'دور بین' آنکھوں سے لگائے 'میدان جنگ' بلکہ کوہستان جنگ کا ماحولہ کر رہے تھے اور جوتیہ ہے کہ جہاں تک ہم بالا نشینوں کا تعلق تھا پہلے دن کی جنگ اتنی ہی خطرناک ثابت ہوئی 'جتنا سینا میں جنگی قلم دیکھتا۔ لیکن ہمارے ساتھی جو دشمن کی گولیوں کی زد میں تھے ایسے خوش قسمت نہ نکلے۔ شام کو پتہ چلا کہ اس دن ہمارے تین جوان مارے گئے۔

قبائلی معرکوں کا سب سے دردناک سین وہ ہوتا تھا جب قبائلیوں کے مکانوں اور برہنوں کو کرکڑیا جلا یا جاتا تھا۔ آجیہ یہ سن کر دیکھیں۔

مدی کے کنارے سبز اور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو آج تک بالکل خالی ہے۔ سب مرد، عورتیں اور بچے پاڑوں میں جا بیٹھے ہیں لیکن سب سحرے مکانوں میں قفل پڑے ہیں۔ وہ سارے بڑی عمر والے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک باندہ والا اور دلکش سا بچہ ہے۔ یہ غالباً گاؤں کے ملک کا مکان ہے۔ حقائق فوج کی آڑ میں سفریٹا کے چند دستے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ کبھی کسی خاص شریر آدمی کا مکان اور کبھی گاؤں کا گاؤں زمین کے برابر کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے مکان ایک طرف سے جس پر ہر ایک کی آنکھ لگی ہوئی ہے اور جو کسی اس کی بنیادوں میں بارود کا دھماکا ہوتا ہے۔ چھ دنوں میں وہ سب قدامت برج چکنا چور ہو کر ایک بے معنی سا ٹکڑی بن جاتا ہے۔ لیکن قبائلی اس حرکت پر کچھ بے جا طور پر مشتعل نہ ہوتے۔ وہ اسے بھی جنگ کا ایک حصہ سمجھتے۔ دن کو ان کے مکان سمار کئے جاتے 'لیکن رات کو وہ لوگ آتے' اپنی فصلوں کو بانی دیتے' مل پلاتے اور مکانوں کا کرنا گویا ایک موسمی مارش سمجھتے اور دوبارہ تعمیر کر لیتے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا۔

اگر کسی دن کوئی آپریشن نہ ہوتا تو قبائلی تقریباً ہی کچھ بچہ کھڑا کر دیتے۔ ایک مرتبہ ہمیں ہفتہ بھر کیپ سے باہر جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ ایک دن تو قبائلی خاموش رہے 'لیکن دوسرے روز اس پہلی زندگی سے نکل آکر انہوں نے فوجی آفتاب کے وقت ہمارے کیپ پر گولیاں برسا کر شروع کر دیں اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک گولوں گولیوں کی دہائی بارش نہ برسا دی گئی۔ ایسی کیاب روٹی میا ہونے سے چلا ہران کی تشفی ہو گئی کیونکہ

تھوڑی دیر بعد ایک اور پیغام آیا:

"نام کا انتظار کے بغیر چل دو، میرا شاہ میں ہوائی جہاز تسمار انتظار کر رہا ہے۔"

حیران تھا کہ یا اللہ ایک خست خم لٹکین کے بغیر کون سے کام بند ہیں جو ہوائی جہاز سے جلا یا جا رہا ہے۔ بہر حال وائیل کو ایک ارمان انگیزی الوداع کی اور پشاور پہنچنے ہی الیہ جو تھ صاحب کے حضور پیش ہوا۔ مجھے دیکھ کر بولے:

"تم آگئے؟ شاباش۔ اب تم سمندر پار جاؤ گے۔ تیاری کے لئے حبس دو دن دیئے

جاتے ہیں۔"

تکلم سن کر باہر نکلا تو آگے جان وائٹ کھڑا تھا۔ بولا:

"دیکھا، یہ ان سارے مٹوں کی سازش ہے۔ سمندر پار ٹیم کلا جانا چاہتے تھا۔ وزیرستان کی

لڑائی تو اب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لئے ہاسٹل بھیج دیا ہے۔ وہ کل پرسوں آجائے گا اور پھر یہ مزے سے برج کھیلے گے اور تم؟ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ سر کو ذرا جھکا کر رکھنا!"

یہ سن کر دل کو سخت صدمہ ہوا۔ فوراً شیر باز کو طلب کیا اور سنے کباب کا آرڈر دیا۔

ساتھ ہی برج کی کتاب منگوا کر مطالعہ شروع کر دیا۔

## سات دن سمندر میں

نام کی جگہ ہمیں سمندر پار بھیج دینے پر فرقہ وارانہ قسم کا فیصلہ تھا۔ اگر ہم سولین ہوتے تو شاید بھوک ہڑتال یا کم از کم سرت مستی کا انتظام کرتے، لیکن فوجی افسر تھے، ضبط کا پاس تھا۔ وہ غلطی عام فوجی سامان سے پرل ڈالا اور پٹر کی تیاری میں مشغول ہو گئے، لیکن شیر باز جو فوجی پابندیوں سے آزاد تھا، فیسے سے مفلوک ہو کر باہر آمدے میں جا کھڑا ہوا اور ہفتوں کیپٹن کین (الیہ جو تھ) کے شجرہ نسب پر روشنی ڈالنے لگا اور اس ضمن میں چند ایسے گوشے بے نقاب کرنے کی کوشش کی جن کا مقام عامہ کی خاطر زیرِ نقاب رہنا ہی ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت الیہ جو تھ صاحب وہاں موجود نہ تھے، لیکن ان کا بیڑا جو ایک باریک ریشے کا ڈھرا سی تھا، شور من کر ادھر آ نکلا۔ شیر باز نے ہنہ کر بغیر کسی تمہید کے اسے دو کچے رسید کئے۔ جس سے مدد اسی بے چارے کا شیرازہ حیات تھوڑی دیر کے لئے منتشر سا ہو گیا، لیکن شیر باز نے اپنے کموں کی شان نزول کی تشریح کرتے ہوئے اسے قسماً دی اور کہا:

"دیکھو مدد اسی، اگر تسمار صاحب موجود ہو، تا تو یہ زحمت نہ دی جاتی۔"

بعد میں شیر باز نے کسی قدر سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا اور اس کی فوری تکمیل کی اجازت مانگی۔ اس منصوبے کے غدد و خال غامضے جارحانہ تھے کیونکہ اس کا مرکزی خیال کیپٹن کین کی زندگی کے ارد گرد گھومتا تھا۔ شیر باز پر پیار تو بہت

دوسرے درجے کے غیر لاکا قسم کے افسر ہیں، بعد تواضع ہمارا استقبال کریں گے اور اگر ہمارے گلے میں ہار وغیرہ نہ بھی پہنا سکے تو ہمارے کانڈات منٹوں میں تیار کر کے ہمارے حضور پیش کر دیں گے۔ آخر ہم انہی لوگوں اور ان کے بال بچوں کی سلامتی کی خاطر ہی ہتھیلی پر جان رکھ کر عرصہ کار گزار کو جا رہے ہیں۔ محروفت میں گئے تو ٹھنڈ بھر تو وہ کمرہ ڈھونڈتے رہے جس سے ہمیں کانڈات ملے تھے۔ دو گھنٹے باریابی کے لئے انتظار کرنا پڑا اور جب آخر باریابی کا وقت آیا تو دفتر کا وقت ختم ہو گیا۔

دوسرے دن صبح وقت پر گئے۔ اپنی جاب بازی کا مفالط کمپ میں ہی چھوڑ گئے۔ وطن عزیز کے دستور کے مطابق دفتر میں جا کر کسی واقعہ کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ ایک کلرک ہمارے محلے کا رہنے والا ہے۔ اس سے ملے اور ابھی چائے کی پیلی ختم نہیں کی تھی کہ کانڈات تیار ہو کر آئے۔

ٹرانزٹ کمپ میں ہمارے چند اہل جان فروش ساتھی سمندر پار جانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ شام کو اعلان ہوا کہ صبح جہاز سوار ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ دوسرے روز بندر گاہ پر پہنچے۔ یہ تھا جہاز اور یہ تھے ہم ملحق سوار ہونے کا حکم نہیں مل رہا تھا۔ پاس سے ایک حاکم نما سے حضرت گز رہے تو ان سے وجہ پوچھی۔ بولے "کچھ نہیں" ذرا کانڈی رکاوٹ ہے" ٹھیک ہو جائے گی۔" یعنی جیل پرانا قصہ تھا۔ کوئی فیہ پرست افسر اپنے اڑیل کلرک کی انجیل پر کسی ضروری کانڈ پر "بندہ" کیا تھا۔ چنانچہ شام ہو گئی اور ہر دو گھنٹہ بعد اپنی جگہ سے بیٹھنے لگے۔ ہمیں حکم ملا کہ واپس کمپ جا کر حکم ملانی کا انتظار کرو۔

معاذ مجھے خیال آیا کہ شاید شیر باز کی دعائیں Delayed Action کی خصوصیت ہو اور اب وہ آہستہ آہستہ قبول ہو رہی ہو اور یہ کہ شاید ہمارا سمندر پار جانے کا حکم ہی منسوخ ہو جائے۔ ساتھی سوائے ایک کے سب انگریز تھے اور وہ ایک نہ صرف "انگریز" بلکہ ہم خیال بھی "انگریز" شہادت میں ایسی کشش نظر نہ آتی تھی چنانچہ ہم دونوں نے ایک مشترکہ دعا مانگی:

"اے مجھوہر کے مالک! ہمارا سمندر پار کا سفر ٹال دے۔"

تاکہ ایک مجلس مکر تیز طبع پٹمان اس سے بہتر کیا فی امداد پیش کر سکتا ہے، لیکن میرے اصرار پر شیر باز نے اپنی تجویز واپس لے لی، البتہ ایک شرط پیش کی کہ جس طرح ہو سکے ہمارے ہو کر ہسپتال پہنچ جائے، بلکہ ہماری بیماری کے لئے شیر باز نے تمام آسانیاں بہم پہنچا دیں۔ مثلاً وہی حکم کہ از کباب چند زود اثر قویہ اور بیسیوں تیرہ صدف و دعائیں، لیکن پٹاور میں ہمارے فقط دو دن باقی تھے۔ پٹھرا اس کے کہ شیر باز کے کباب کارگر اور دعائیں مستجاب ہوتیں، ہمیں بھی کاٹک دے کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

پٹاور سے چلتے وقت ہمیں ہدایت کی گئی کہ ایک دن راولپنڈی میں ٹھہر کر تھوڑی سی سیل سے ایک کٹ مینی سفری چلک اور غسل وغیرہ کا سامان حاصل کر لیا۔ چٹائی میں چند دوست ملے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم سمندر پار جا رہے ہیں تو انہوں نے ہمیں اسی حسرت سے دیکھا جس حسرت سے بن کھلے مرتھانے والے غریب کو دیکھا جاتا ہے۔ ایک رقیق القلب دوست کی ہمدردی تو کچھ تعزیت کی سی شکل اختیار کر گئی جسے ہم نے بھی مظلومی بلکہ شہادت کے عالم میں قبول کیا۔ ان دونوں یوں بھی غیر ملکی تقاضوں کے لئے جان و مال کی قربانی کی علامت نہ سمجھا جاتا تھا اور ہم پر تو مزید ستم یہ ہوا کہ چند گوروں کی برنج کی خاطر موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے تھے۔ ہر حال ان تمام ناگمانی، لیکن ذرا شیر گرم ہلاؤں کی دعائیں لگتے ہوئے جو ہمارے سمندر پار جانے میں حائل ہو سکتیں، ہم نے سربازانہ طور پر کھا۔ مثلاً یہ کہ ریل پٹری سے اتر جائے اور ہمیں معمولی سی چوٹیں آجائیں، مگر ہڈی نہ ٹوٹے، لیکن گاڑی دغاؤں اور تھنوں کو نظر انداز کرتی ہوئی صبح و سالم یعنی پہنچ گئی۔ گاڑی سے اترتے وقت کچھ غصہ تھا کہ ہم فوری طور پر لڑائے جانے کے قابل تھے۔

بہی میں ہمیں ٹرانزٹ کمپ میں رکھا گیا۔ معلوم ہوا کہ جہاز دو دن کے بعد روانہ ہوگا۔ چنانچہ ہمیں حکم ملا کہ ان دو دنوں میں امبارکیشن آفس سے اپنے سفر کے کانڈات وغیرہ حاصل کر لو۔ عام لوگوں کو دفتر سے کانڈات برآمد کرنا بیش مشکل ہوتا ہے، لیکن ہم عام آدمی نہ تھے، رہنما کے فدائی تھے۔ کھن بدوشی نہ سہی، لیکن شناختی حققتی گلے میں ڈال رکھی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ امبارکیشن دفتر کے دروازے پر دستک دیں گے تو تمام افسر جو ہر کیف



سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہو تو آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ لوہو کے فن پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنا مناسب نہیں، مختصر یہ کہ استاد لوہو بڑے صحت بخش فنکار تھے۔

سفر کا دوسرا اہم واقعہ ایران کی جنگ تھی، ہر صبح اور شام جہاز کے ڈرائنگ روم میں وائرلیس سے مرتب کردہ خبرنامہ پورڈ پر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ روانگی کے دوسرے یا تیسرے روز خبر آئی کہ اتحادیوں نے ایران پر حملہ کر دیا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے یہ حملہ ہندوستانی فوج ہی کے چند دستوں کی مدد سے کیا تھا، تاہم ہمیں ایرانی بھائیوں سے بھی ہمدردی تھی۔

جہاز کے سفر تو ایرانی فوجوں کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن ہم چاہتے تھے کہ اگر وہ جیت نہ بھی سکیں، تو وہاں شجاعت کا کچھ کر باریں، چنانچہ دوسری صبح ہم کسی قدر بے تابی سے خبرنامہ پڑھنے لگے، لیکن یہ سرفی دیکھ کر ہمیں یقین ہوئی کہ ایران میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہے۔

تفصیل سے اس اہم واقعہ کی یہ ہے کہ انگریزوں اور روسیوں نے ایک دن کسی اشتعال کے بغیر ایران پر حملہ کر دیا۔ اس ایران کو اس بد تمیزی پر غصے سے زیادہ حیرت ہوئی اور پیشتر اس کے کہ غصہ آتا اور اس کے اٹھار کے لئے میدان جنگ میں اترتے، وہاں باز حملہ آوروں نے میدان جنگ سمیت ایران پر قبضہ کر لیا۔ حق بات یہ ہے کہ ایرانی بے خبری میں مارے گئے۔ ویسے ان کی فوجی قوت کا معیار بھی وہ نہ تھا جو آج ہے۔ یہ اسی لڑائی کا نشانہ تھا کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی تخت سے دستبردار ہو گئے اور موجودہ شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی تخت نشین ہوئے۔

کیوں اور کیسے؟ یہ باریکیاں ہم نے اللہ میاں پر چھوڑ دیں۔ ہم نے دعا کے اس پہلو پر البتہ بہت زیادہ زور دیا کہ فوری توجہ کی مستحق ہے، لیکن خدا جانے ہماری دعائیں کوئی ٹاپ کی غلطی رہ گئی تھی یا لیبل مللڈ لگ گیا تھا، صبح جاگے تو حکم ہوا کہ جہاز سہ پہر کو نکلنا چاہئے گا۔ مسافریارہ بچے بندرگاہ پر پہنچ جائیں۔ اسی شام ہم اپنے کیمپ میں بیٹھے مغرب کو رواں تھے۔

ہمیں اتنی ہی اندازہ تھا کہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ منزل مقصود کونسا مقام ہے۔ لڑائی ان دنوں مصر سے آگے لیبیا میں سوسینی کی فوجوں کے خلاف ہو رہی تھی، چنانچہ خیال تھا کہ سویڈیا پورٹ سعید اتریں گے، لیکن دوسرے روزی کسی کے کان میں آکر کہا۔ "بھروسہ اتریں گے، لیکن تانا کسی کو نہیں۔" ہم نے کسی کو بتایا یعنی سوائے اپنے دوست کے، لیکن اسے پہلے ہی سے علم تھا اور ہمیں تانے کے لئے بے تاب تھا۔ چند گھنٹوں میں سب کو معلوم ہو گیا، لیکن سرکاری طور پر ہمارے منسلک بڑی کامیابی سے خفیہ رکھی جا رہی تھی۔ پچھلے پہر جہاز کے ملازم سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کی صبح کو بھروسہ پہنچیں گے۔ یہ تفصیل غالباً Top Secret (خفیہ ترین) سمجھی جاتی تھی۔

جہاز کے نکلنا اٹھانے کے بعد بظاہر کوئی ایسا اعلان نہ تھا کہ ہمارے سفر جنگ میں کامیاب رکاوٹ پڑ سکے، لہذا جہاز کو خانہ خویش سمجھ کر اس کے کچھ دور دیکنا شروع کئے۔ ہمارا پہلا سمندری سفر تھا۔ جہاز کا کوئی ناویکھ مارا، لیکن شاید یہ ہماری کالہ چوٹی کا فیض تھا کہ اچانک جہاز نے ہمارے پاؤں سے نکل کر ہمارے گرد پکر لگایا۔ ہمارے اعضاء کے کچھ کے بعد دیگرے ہمیں خبر یاد کما اور ہم بمشکل سر کو تھامے کیمپ میں پہنچے اور دروازہ ہو گئے۔

یہ سمندری علالت بھی عجیب علالت ہوتی ہے۔ اچھا بھلا آدمی بیٹھے بیٹھے اپنے آپ پر گرفت ڈھیلی پاتا ہے۔ ہوش و حواس درست ہیں، لیکن ان کی درستی کا کوئی تاخذہ نہیں، کیونکہ اعضاء پر اختیار نہیں۔ اس عمل بے بسی کے عالم میں زندگی پر ایک گہری پوست محیط ہو جاتی ہے اور غریب مسافر اپنے آپ کو بھرے جہاز میں مجبور و معذور پاتا ہے۔ اس بے چارگی میں ہمارا دلچسپ ایک گوانی ملازم بنام لوہو تھا، لیکن لوہو شوق خدمت میں فقط دلچسپی کا قائل نہ تھا۔ اگر آپ کو ان دنوں جہاز "اسلامی" سے سفر کا اتفاق ہوا ہو اور لوہو کی خدمات

سرمایہ چاک نہ ہوا بلکہ جی کڑا کر کے ایک دوسرے سے ٹیک مایک بھی کرتے رہے۔  
آخر پہنچے دن غروب آفتاب سے کچھ پہلے ایک صاحب خوشی سے پٹا اٹھنے "دو دو کمر  
خفگی" ساری عمر خفگی پر مزاری تھی اور اس عمر سے میں غالباً اسے دیکھا بھی ہو گا لیکن اس  
روز محسوس ہوا کہ جج جج ہم خفگی دیکھے بغیر ہی اس پر قیام پذیر رہے ہیں۔ چنانچہ بالکل اسی  
انداز سے تیسے سرکس دیکھتے ہیں ہم نے زمین کے اس ٹکڑے کو دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر  
بعد شط العرب میں داخل ہوئے تو دونوں طرف در قاسطے پر کھیت اور انسان نظر آنے لگے۔

انہیں دیکھنا تھا کہ ہمارے دلوں میں بھی نئی نوع انسان کے لئے جن میں ہمارے علاقے بھی  
شامل تھے، محبت کے بیٹے پھوٹنے لگے۔ ایک دوسرے کو سمندر میں جیتنے کے تپاک  
منصوبوں کا شرمندگی سے اعتراف کیا اور پشیمان انگریزوں کی طرح انہیں واپس لیا۔ جب ڈنر  
سے فارغ ہو کر اپنے کمروں کو لوٹے تو جہان پر ایک مکمل اور پرامن جہان ہائے باہم  
(Peaceful Co-Existence) کا عالم تھا۔

صبح ہوئی اور جاگے "تو ہمارا جہاز بھرے کی بندرگاہ میں کڑا تھا۔ بڑے اشتیاق سے باہر  
جھانکا کہ اس نئے ملک کا ٹاک نقشہ تو دیکھیں "ایک ٹوکس بورڈ پر نظر پڑی "لکھا تھا:  
"مسلمان پر نگاہ رکھیں اور چوروں سے ہوشیار رہیں۔"

اطمینان ہوا کہ الف لیلیٰ کی اس روایت انگیز سرزمین اڑھائی ہزار سال پہلے کم از کم ایک قدر  
ضرور مشترک ہے لیکن سوچا کہ عراق اور ہندوستان کی مشابہت کا یہی عالم ہے "تو ہمارا سفر  
بیکار رہا۔ کیا اس سے یہی بستر نہ تھا کہ پشاور میں ہی اپنے مال و اسباب کی خبر دہائی کر رہے  
رہے۔ لیکن آئندہ چند ماہ میں جب بھرہو و ہندو کو ذرا قریب سے دیکھا اور وہاں کی زندگی کے  
کچھ دوسرے گوشے بے نقاب ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس خطے کی ریختیں شہزاد کے ساتھ ہی  
ختم نہیں ہو گئیں بلکہ

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

۱۔ تاریخی مل عام طور پر اس م کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ ایک خاص روئے سے بہتا ہے۔

## بصرہ اور شائبہ کیمپ

بصرہ اگرچہ پہلے نہ دیکھا تھا تاہم ذہن اس کے تصور سے یکسر نکالی نہ تھا۔ شٹا بھین میں  
تفصیلی کی کتابوں میں جو کچھ بڑھ چکا تھا اس سے بھرے کا تصور سرخ مٹی کی مجبوروں کی شکل میں  
ہمارے دل میں "نونا سا" انہی انوں کے ہاتھوں کے "مکھوٹے" کی پسماندہ یاد یہ بھی تھی کہ  
بصرہ لندن یا جنیوا کے رستے میں ایک عریض ہوائی اڈا ہے۔ اگرچہ اس اڈے کا تصور مزیک  
کے ٹانگوں کے اڈے سے مختلف تھا لیکن بڑے ہو کر ان فوجیوں سے بصرہ کے فیسے سے تھے جو  
پہلی جنگ عظیم میں اسی بندرگاہ پر انز کر میسو پوٹیمیا کے میدان میں کام آئے تھے یا یوں کہیں  
کہ بیکار گئے تھے تمام آنے والوں نے آکر کیا قصے سنائے تھے اور بعد میں شاید ان ہی فوجیوں  
کے بصرہ ہمارے لوگ گیتوں میں بھی گھس گیا تھا۔ شٹا دو پہلی گاؤں  
جسکی دن گئی "بھرے نوں گئی"

تے موڑیں یاد اڈانگ والیا سردارا

(اگرچہ گیت کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود خاتون نے بھرے میں گھسنے کی کوشش  
کی تھی۔ اللہ جانے کیوں؟)

جہاز سے اترے تو معلوم ہوا کہ ہماری منزل بصرہ نہیں بلکہ بھرہو سے کوئی پندرہ میل  
مغرب میں ایک بہت بڑا کیمپ ہے جسے شائبہ کیمپ کہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مقام

نہیں بلکہ سروے کر معرفت حاصل کی جاتی ہے۔"

سوچا کہ اگر سعدی شیرازی بجائے شاہد میں پیدا ہوتے تو معرفت کا ایسے آسان نسخہ تجویز نہ کر پاتے۔

شاہد کمپ میں پہنچے تو پہلی مرتبہ انسان نظر آئے یعنی ہندوستانی اور برطانوی فوجوں کے سپاہی 'شاہد ایک Re-Inforcement Camp تھا۔ یعنی اس میں فوجی لوگ محاذ جنگ پر بھیجنے کے لئے قہقہہ کے طور پر رکھے جاتے تھے۔ اس وقت ہمارے دو ڈویژن محاذ پر تھے اور ان فوجیوں کو ملک 'شاہد سے ہی جاتی تھی۔ کیا سپاہی کیا افسر کمپ میں مسافری تصور ہوتے تھے اور کمپ میں ٹھکانے کے بعد چند دنوں میں آگے محاذ پر بھیج دیے جاتے تھے، لیکن یہاں خدا کے کچھ پراسرار ہندے ایسے بھی تھے جنہیں فطرت نے مفت خوری کا لازوال شوق بخشا تھا اور جنہوں نے تمام تر جنگ 'شاہد کے فوجی خانوں اور میسوں میں ہی گزار دی تھی۔ فوج میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ دو جو کر جنگ جیتنے ہیں اور دو جو کھا کر جیتنے ہیں۔ 'شاہد کمپ میں دونوں قسم میں جاتی تھیں۔ جگر گداز منظر اس گھڑی ہوتا تھا جب ایک ایک کھا کر جیتنے والے کو محاذ جنگ پر جانے کا حکم ملتا تھا اور غریب مال نہ پاتا تھا۔ ہم نے چند ایسے ہی مناظر دیکھے اور ہر مرتبہ کچھ منہ کو آئے گا۔

ایک پکستان صاحب کا وقت سفر بھی نہ بھولے گا۔ یہ حضرت شاہد کے ہاتھوں میں سے تھے اور آپ نے اپنا تمام وقت اس چھوٹے سے دائرے میں گزار دیا جس کا مرکز کمپ کامیس تھا۔ حضور کا بڑا ٹٹیل سا نام تھا جو چھوٹی "سی" پر ختم ہوتا تھا۔ مزاج میں ریگینی تھی اور اکثر اپنی شجاعت اور عشق کی داستانیں سنایا کرتے تھے بلکہ ان دنوں اپنی مراد آبادی معشوقہ کو بصرہ میں لانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اچانک ایک دن آپ کو محاذ پر جانے کا ذرا اٹل سا حکم مل گیا۔ کیا بتائیں کہ اس مجاہد نے اس صدمہ سے بچنے کے لئے کیا کیا بھانے تراشے؟ آپ نے جملہ انگریز افسروں کو با آواز بلند خبردار کیا کہ یاد رکھو! اگر ہمیں محاذ پر بھیج دیا تو شاہد ویران ہو جائے گا۔ ہندوستانی فوج کا مورال تباہ ہو جائے گا۔ جیسے مراد آباد کا War Effort برباد ہو جائے گا اور اوجھر سلطنت برطانیہ کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ دلائل یہ شک و شبہ

کا عملی نام تو شہید ہے لیکن اس کا "ع" انگریزوں کے حلق میں انک کر رہ گیا ہے۔ ناموں کے سلسلے میں ہم انگریزوں کی زیادتی سے اپنے ملک میں بھی آشنا تھے۔ شفا حیدر آباد کا انگریزی نام ہائڈرا بڈ تھا اور کشمیر کا کشمیر۔ لیکن عراقی ناموں کے ساتھ تو انگریزوں نے اچھی خاصی سکشا شہی چار کھی تھی۔ شفا بنداویک ڈیڈ تھا۔ موصل کو موصل کہتے تھے اور معقل کو مارگل بتا دیا تھا۔ انگریز تو خیر اپنے حلق کی بے بسا معنی کی وجہ سے شاید غلط تلفظ پر مجبور تھے، لیکن حیرت بلکہ رعب ان ہندوستانیوں پر آتا تھا جنہیں اپنی فلاح یک ڈیڈ کہنے میں ہی نظر آتی تھی۔

سرزمین عراق کے وہ چند رہیل جو بصرہ اور شاہد کمپ کے درمیان تھے ہماری زندگی میں ایک انوکھا تجربہ تھے۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی ایسا اصل دیکھا تھا نہ دیکھا تھا۔ خود بصرہ تو دجلہ کی گزرگاہ کے فضیل بہت سرسبز اور شاداب تھا اور مجبوروں کے درخت تو وہاں انسانوں سے بھی زیادہ تھے، لیکن بصرے سے باہر نکلتا تھا کہ سبزہ یک قلم غائب ہو گیا اور انسان بھی تقریباً غائب شد۔ نگاہ تک لقی و قوت اور ہموار رنگت نہ تھی جس میں کسی بھی شے کا وجود تھا۔ سوائے کسی بھنگے ہوئے گدھے یا بکے ہوئے اونٹ کے جو دور اٹلی پر ٹکراتے تھے۔ اگرچہ ان کے وہاں ہونے کی بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ بانی تھا نہ نباتات۔ بتول مالی "خدا کی زمین بن جتی سرسبز تھی۔" ممکن ہے کہ اس ضمن میں گدھے اور اونٹوں کا کوئی اپنا زاویہ نگاہ ہو، لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ان کے تاثرات معلوم کر سکیں۔ ہمارا قافلہ رواں تھا اور ہم برابریدے بھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ کیس گھاس کی واحد پتی ہی نظر آجائے۔ لیکن وہ آئی۔ سعدی کا شعر یاد آیا۔

برگ درختان ہز در نظر ہوشیار  
ہر درخت و درخت معرفت کردگار

اور محسوس ہوا کہ ہم خواہ کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں 'شاہد کے نواح میں ہمیں معرفت کرو گا ذرا مشکل سے ہی میسر ہوگی۔ ہمارے ایک ساتھی جو سیدھے بولے:

"بجائے ہر دوست 'شاہد کرو گا سے زیادہ کرلا کے نزدیک ہے۔ یہاں پتے دیکھ کر

تھکانہ نہ تھا۔

چار ماہ کے باپتہ سیکڑ ٹھیکٹ کو اپنی برادری سے اوجھڑ کر اپنی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا سامراجی تشدد کی ایک اور مثال تھی، لیکن کانگریسی تو مخالفین کی لاری کے آگے لیت جاتے۔ بس دانت پیس کر نہ رہا اب ہی اپنے جذبات کا اظہار کر لیا۔ دل ہلکا ہوا تو پوریا بستر اٹھایا اور برٹش ونگ چاہنچا۔ وہاں ہر طرف گورے ہی گورے تھے۔ کیا افسر کیا سپاہی، بلکہ بیرے خانائے تک انگلستان سازتہ تھے۔

ایک گورہ سپاہی ہمیں بطور اردلی ملا۔ اس نے آتے ہی ہمیں سیلوٹ کیا اور بغیر بات کے ہمارا بستر لگایا۔ مخالفین قریب سے رکھا۔ ہوتے پالش کے اور چائے لایا۔ ایک انگریز کو یوں دن دباڑے اپنی خدمت کرتے ہوئے کہ محسوس ہوا جیسے سچ بیچ ہماری صاحبزادی کی ابتدا ہو رہی ہے۔ معنا ہمارے خروانہ ذہن میں خیال آیا کہ سب انگریزوں کو بد دماغ سمجھنا مناسب نہیں ہوتا، چنانچہ ہم اس گورے غلام کے لئے اب سراپا شفقت تھے۔

گورہ ہمیں خدمت سے فاسد ہو چکا تو پہلی مرتبہ ہم سے ہر کلام ہوا، لیکن کلام کیا تھا، ایک لڑائی سی انگریزی لڑا آواز ہمارے سامنے سے گزر گئی، لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابل فہم نقش نہ چھوڑا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات پھر دہرائی، لیکن ہمارے دماغ کے نقش بدستور دھندلے اور تھوڑی سی قسم کے تھے۔ گورہ اب خاموش کھڑا تھا، سوچا کہ کیوں نہ ہم ہی کچھ کہیں، پھر کچھ صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اظہار مدعا کیا۔ گورے اردلی نے اپنی انگریزی کی داد میں ایک نخلصانہ مسکراہٹ ضرور پیش کی، لیکن جہاں تک اس انگریزی کے اور اک کا تعلق تھا، ظاہر تھا کہ غریب سراسر معصوم ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی گفتگو میں کوئی نقطہ اتصال نہیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشتق سخن جاری رکھی تو ہماری انگریزیاں بالکل متوازی چلنے لگیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشتق سخن نہیں کی، چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دو سرے کو سمجھنے لگے۔ بتول وارن:

ہاتھ لگے اپنے دونوں کام کے

تھے، لیکن غلاموں نے ان کا وزن کرنے سے ہی انکار کر دیا اور آپ کو اس لاری پر سوار ہونا ہی پڑا جو ایک صبح محاذ کو تک لے کر جا رہی تھی۔ اس قیامت خیز ساعت میں آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ جنسین دیکھ کر سارے شاہد پر رقت طاری ہو گئی، لیکن لاری کا حرکت کرنا تھا کہ حاضرین میں ایک بے پناہ فتنہ گونج اٹھا۔ ایک دل بٹلے نے مراد آبادی معشوق کو پکار کر کہا: "تو نیز بر سرِ بام آگہ خوش تماشا الیت"

اس وسیع یکپ کے دو حصے تھے جنسین ونگ (Wing) کہتے تھے۔ یعنی برٹش ونگ اور انڈین ونگ۔ برٹش ونگ میں فقط گورہ افواج تھیں اور ان کے افسر، یہ ونگ یکپ کے سرے پر تھا۔ مشرقی حصہ انڈین ونگ تھا۔ اس میں ہمارے ہندوستانی سپاہی اور ان کے افسر رہتے تھے۔ ان دونوں انڈین آرمی کے افسر بھی زیادہ تر انگریزی ہوتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ دیسی افسر بھی خاصی تعداد میں آنے لگے تھے جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی سب تھے جو باہم شہر و شکر تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستان میں فوج کو چھوڑ کر زندگی ایک مسلسل مسلم دنگ تھا جس میں اکثر سکھ بھی منہ کاڑا کرتے تھے، لیکن ان کے لئے شال ہو گیا کرتے تھے اور غلط پارسی ہی اس بزم خیر و شر کو سامنے سے دیکھتے تھے، لیکن فوج میں تمام دیسی افسر ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور اگر خدا واسطے کا پھر تھا تو صرف انگریزوں سے ہندوستان کی فکری کی وجہ سے شاید ہم لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ حساس بھی تھے اور خواہ مخواہ انگریزوں سے ایجنے کو جی چاہتا تھا، لیکن جنگ چھڑنے کے بعد بظاہر برٹش افسروں میں جی اتصال اور یکجہزی کی بھرتی ممنوع نہ تھی۔ پھر عہدے کے لحاظ سے یہ لوگ ان دونوں ہم سے تقریباً پیشہ سیکڑ ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیسی اور انگریز افسروں میں اچھی خاصی فرقہ وارانہ کشیدگی رہتی تھی اور اسی وجہ سے افسروں کے میسوں میں بارہا نقص امن کی وارداتیں ہوتیں۔

شاہد پہنچنے پر معلوم ہوا کہ انڈین ونگ میں اگرچہ اکثریت انگریز افسروں کی ہے، تاہم ہندوستانی افسروں کی تعداد بھی خاصی ہے، چنانچہ خوشی ہوئی کہ شاہنے کا چند روزہ قیام خوب گزرے گا، مگر ابھی بستر بھی نہ کھلا تھا کہ حکم ملا: "تم برٹش ونگ میں قیام کرو گے" وجہ یہ بتائی گئی کہ اس یکپ میں صرف رائل سیکڑ کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈین سیکڑ کو کوئی آدمی یا



دی گھاگھی، لیکن عجیب بات تھی کہ عین اس وقت کوئی دلی افسر نظر نہ آ رہا تھا، البتہ ایک قریب کے خیمے سے قہقہے بلند ہو رہے تھے جو لاریب افسرانہ تھے۔ چن اٹھا کر داخل ہوا تو بھی کوئی پاپا۔ عمار، قاضی، اصغر، قتالیہ، بھائی، کپانی، امیر، سوامی، جیتے، نادر اور کئی دوسرے جن سے ابھی تعارف نہیں تھا، ہماری آمد کو حسب معمول ایک ایسے فخرے سے منایا گیا جس کا اثر شائبے کے دیگر خیموں میں ایک جگہ سے ڈھلنے کے طور پر محسوس کیا گیا۔ پوچھا کہ فرزند ان ہند اس بند قبو میں بیٹھے کیا سازش کر رہے ہیں تو بتایا گیا کہ کونسل آف انڈین کا

ہوا یہ تھا کہ ایک انگریز بحیرہ نام مڈوے (Midway) نے کپٹن اجندر سنگھ قتالیہ کے خلاف ایک کیس کھڑا کر دیا تھا۔ انھیں چار سب پر رکھ دیا تھا۔ فرد جرم میں مذکور تھا کہ ملزم کو کبیرے دیکھنے کے لئے شائبے سے گھر جانا تھا۔ کوئی اور سواری نہ ملی تو آرمڈ کار یعنی بکتر بند گاڑی لے کر ہی نکلتا دیکھنے جا کر وہ غیرہ وغیرہ اب ایوان کے سامنے سوال یہ تھا کہ قتالیہ کیا مقامی ہیں؟ گفت و گو پورے پورے کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ ملزم اور کتاب جرم سے صاف انکار کرے اور ثبوت میں نہ آئے پھر خاں ذرا نیو سے شہادت دلوائی جائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ملزم ڈٹ کر اقبال جرم کرے، لیکن ٹریڈنگ کا بمانہ کرے۔ اگر پوچھا جائے کہ یہ حرکت سرشام کیوں کی گئی تو عدالت کی توجہ ٹریڈنگ کی اہمیت کی طرف دلائی جائے۔ یہ سوال کہ ٹریڈنگ کبیرے پر کیوں باقلم ہوئی تو اس کی وجہ Compass Error یعنی قطب

مجھے یہ دوسری تجویز کچھ مذاق سا معلوم ہوئی، لیکن دوسرے روز قتالیہ نے کورٹ کے سامنے یہی صفاتی لفظ ملحد پیش کر دی۔ عدالت نے جس کے ارکان یقیناً اٹل دل تھے۔ اپنے قاضیانہ فیصلے میں لکھا کہ کوئی جرم سرزد نہیں ہوا کپٹن قتالیہ کو ایک بہتر قطب فرمایا گیا جائے۔

قصہ مختصر اگلی مرتبہ قتالیہ صاحب کبیرے دیکھنے گئے تو ٹریڈنگ میں تشریف لے گئے۔ ہر چند کہ انھیں ایسی سواری کی ضرورت نہ تھی، یہ حرکت محض بحیرہ مڈوے کی خوشنودی مزاج

شام کو برٹش ونگ کے افسروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ گورے اردلی سے بھی زیادہ قاضع اور احترام سے پیش آئے۔ پہلے تو حیران ہوا کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو، لیکن فوراً معلوم ہو گیا کہ ان کی شرافت کی وجہ کچھ اور ہے، یعنی یہ کہ ان انگریزوں نے ابھی تک ہندوستان نہیں دیکھا اور فرعونیت کا انھیں عملی تجربہ نہیں ہوا۔ وہ لوگ سیدھے ولایت سے شائبہ آئے تھے اور ایک غیر ملکی کو انگریزوں کی خاطر لاتا دیکھ کر اسی طرح ممنون ہوتے تھے، جیسے دنیا بھر کے مسلمان محمد علی بخاری کے قبول اسلام پر مسرور ہوتے ہیں۔ آج محمد علی کسی اسلامی ملک میں آتے ہیں، تو لوگ دیدہ و دل فرش راہ کو ہیں۔ انگریزوں نے اس قسم کے افسانے کو دیکھ کر ہمارے رستے میں نہ بچائے، لیکن ان کا انگریزی بدل ضرور پیش کیا، یعنی تپاک سے مصافحہ کیا۔ چائے پلائی، لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا انداز ملاقات تھا۔ جو بھی ملتا اس کے چہرے پر شکستگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی گفتگو سے سرپرستی اور بے نیازی نہ چھٹی تھی، ہندوستان کے انگریز حاکموں کا ٹریڈ مارک تھا۔ وہ اپنے مخاطب کو اپنے برابر بھی سمجھتے تھے اور قابل عزت بھی۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن میں طبعاً اتنا ہی مزاج بھی نہ تھا کہ ان لوگوں سے مکمل مل جاتا۔ محض مصافحوں یا مسکراہٹوں پر مستقل گزارا مشکل تھا، برٹش ونگ میں آرام ضرور تھا، لیکن محو قفس کے آرام سے ملتا جلتا اور پھر زندگی فتنہ آرام کی زیادتی ہے ہی عبارت نہیں، بلکہ اگر آتش جواں ہو جیسا کہ وہ تھا، تو فالو آرام ایک عجیب بدلی کوفت اور دلچسپی کا باعث ہوتا ہے، چنانچہ جی چاہتا کہ بھاگ کر کیمپ کے ہندوستانی حصے میں جاؤں اور اپنے ہم وطن دوستوں کے ساتھ مل کر اووم بچاؤں اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن انڈین ونگ میں گورہ کھاسپاہیوں کو سنگل کی تربیت دینے کے لئے ایک افسر کی ضرورت محسوس کی گئی اور نظر انتخاب ہم پر پڑی، چنانچہ بظاہر کسی قدر وقار کے ساتھ، لیکن باطن ہزار بے تابی سے انڈین ونگ میں پہنچے اور دو لٹل شکرانے کے درجے۔

برٹش ونگ کی دھیمی دھیمی بے آوازی فضا سے نکل کر انڈین ونگ کی رنگ رنگی دنیا میں پہنچا، تو یوں محسوس ہوا جیسے انارکلی میں آٹکا ہوں۔ دی انارکلی کے رنگ و صوت اور

کا انتظام بھی فرما دیتے۔

ج تو یہ ہے کہ مجرموں کی بدتمیزیوں ہماری زندگی کا حصہ بن گئی تھیں، لیکن بد قسمتی سے ایک دو ناموافق حادثوں کے بعد مجرم صاحب خوش تمیزی پر اتر آئے جس کا ہماری صحت پر خاصا ناگوار اثر پڑا یعنی ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا، اور خالی مسلمان ہی نہیں، پکا حاکمی بن گیا۔

لیکن جس چیز نے قصبہ شائبہ کو رتھن کر دیا وہ غریب مٹوے کا لونہ تھا، بلکہ خوبان بھرو کے سب سے زیادہ کامنازہ تھا۔ بھرو شائبے سے بہت دور نہ تھا۔ یہی کوئی چودہ پندرہ میل، چنانچہ ہماری ہر شام بھرو میں گھومتی تھی۔ پہلی مرتبہ ہم ایک اتوار کی صبح کو وہاں گئے اور یہ گئے اور یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ عراقی محلوں میں ہندوؤں کی طرح گورے بھی ہیں اور کالے بھی، لیکن خواتین عراق سب کی سب لالہ رخ اور سب برہمن ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لالہ و سمن کسی قدر انھیں کے شس و خاشاک سے آلودہ تھا، لیکن ہم آملہ درجہ دوم کے حوالے ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس معلوم ہوتا تھا کہ بھرو کے بازاروں کی بھنگا نہیں بھی اگر کسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں پہنچ جائیں، تو بغیر تعارف کے جو نیز مہارانیوں بن جائیں۔ اس قدر بے محابا حسن کوہنوں کے محروں میں لباس اور ننگے پاؤں دیکھ کر دل دیکھنے سا کا، بلکہ ہمارے ایک دوست نے تو جب پہلی عراقی حینہ کو ننگے پاؤں دیکھا، تو تڑاق سے اسے جوتے خرید دیئے، فرمائے گئے۔

”کیا ستم ہے یار، پھولوں جیسے نازک پاؤں اور انگاروں کی سی زمین پر ملیں، میری حیت کو گوارا نہیں۔“

لیکن بعد میں جب ایسی ہی گل انداموں کے ٹخنے کے ٹخنے دیکھے جو بلا تکلف بھرو کے بازاروں میں ننگے پاؤں پھر رہی تھیں، تو کسی قدر سراسیمہ سے ہو گئے۔ غالباً دل ہی دل میں آپ نے اپنی پونجی کو ان برہمن پاجیناؤں کی تعداد پر تقسیم کیا اور دیکھا کہ حاصل قسمت اتنا بھی نہیں کہ فی حینہ ایک اچھی بھی ڈھک سکے۔ اس سادہ تقسیم کے سوال نے انھیں گہری روحانی دنیا سے نکال کر بھرو کے پتے چوک میں لاکھڑا کیا، چنانچہ اب وہ بے پاپوش دو تیز ناؤں

کے لئے کی گئی تھی۔ مٹوے نے جب یہ خبر سنی تو اس سے زیادہ بے بس اور مضطرب انگریز برطانوی سلطنت میں اور کوئی نہ تھا۔ بے بس اس لئے کہ ابھی ابھی ایک نیا قطب نما تالیہ کو دے چکا تھا۔ زبان کھولنا تو نیا ٹیک بھی پیدا کرنا پڑتا۔

کیمپن تالیہ کی مسم نے مجرموں کی شکایتوں کا تو تقریباً قلع قمع کر دیا۔ لیکن اس کی بدتمیزی کا انداد مشکل تھا۔ مجرموں کی بدتمیزی کچھ خدا دادی چیز تھی اور اس باب میں وہ خاصا برگزیدہ شخص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس جنس کی تقسیم کے وقت اسے قرب خاص حاصل تھا اور کسی مخالف کے تحت اس نے اپنا دامن ذرا زیادہ پھیلا دیا تھا اور اب اس بیکار اور بے گناہ کو اس آزادی سے استعمال کرتا تھا کہ اس کی ترکیب استعمال پر داد دینے کی جانتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے مجرم صاحب سے کام پڑ گیا۔ ان کے دفتر میں چار بھڑکے اور دروازے پر کھڑے ہو کر معروف انگریزی طریقے سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔

”میں ایک سیکنڈ کے لئے اندر آسکتا ہوں؟“

مجرم صاحب بولے: ”ہاں آؤ۔“

اندر داخل ہوا اور ابتدائے کلام کرنے لگا، ”تو کھڑی دیکھ کر بولے:

”ایک سیکنڈ ہو گیا ہے، آپ جاسکتے ہیں!“

بات تو ٹھیک تھی۔ ایک چھوڑ ڈیزد سیکنڈ ہو گیا تھا۔ مودبانہ سلطنت کیا اور باہر آیا اور ج تو یہ ہے کہ مجرم صاحب کی بدتمیزی پر پیار بھی آیا، لیکن بد قسمتی سے یہ بدتمیزی کسی قدر ان کی پریشانی کا باعث بنی۔ ہوا یہ تھا کہ مجرم صاحب کے پاس ان کی ہنگامی کافر حاصل کرنے سے علاوہ سرکاری کام سے گیا تھا۔ مجھے یکپ کے کمانڈر انٹ صاحب نے چند ضروری کاغذات دے کر بھیجا تھا کہ مجرموں کو پہچاننا۔ ایک سیکنڈ کی مسلت میں یہ کاغذات پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی، چنانچہ دوسرے کو جب کرل صاحب لٹچ پر ملے تو انھیں واپس کر دیئے اور ساتھ ہی وجہ بھی عرض کر دی۔ یہ معلوم نہیں کہ بعد میں مجرموں نے اور کرل صاحب کے درمیان کیا گزری، البتہ بعد ازاں جب بھی ہم نے مجرموں کے دروازے پر دستک دی تو وہ یہ نہیں پوچھتے تھے کہ کیا چاہتے ہو، بلکہ یہ کہ کیا لائے ہو اور جی کڑا کر کے ایک باکفایت سی مسکراہٹ

کی ہیئت چمائی ہو چنانچہ اس نے سکون اور وقار کے ساتھ انہی کی التجاسی اور پھر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ گویا کہتی ہو کہ یہ وہ مقام ہے جہاں جو اب دینا خاوند کا کام ہے اور کتنا ہی بے جان خاوند کیوں نہ ہو یہ آگ بجولا ہونے کا وقت ہوتا ہے چنانچہ خاوند موصوف حسب توفیق آگ بجولا بھی ہوئے اور اٹھ کر کچھ کر مرے کو بھی تھے کہ کیانی نے ان کے سر کو ہاتھ سے دبا کر کرسی پر بٹھا بلکہ چپکا دیا۔ کیونکہ اس کے بعد مسز ایلاس نے اٹھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اب ان میں آگ باقی تھی نہ بجولا بس ایک ٹیل شدہ خاندانیت لے کر حالات حاضرہ کا

اب معاملہ مسز ایلاس اور کیانی کے درمیان تھا۔ مسز ایلاس نے موقع کا جائزہ لیا۔ کیانی کو ایک واجب قمر سے دیکھا پھر اٹھی اور اٹھ کر اس کے رخسار پر ایک پلاسما تھپڑ لگایا۔ وہی تھپڑ جو مردانہ بد تمیزوں کا روایتی تسکونی جواب ہوتا ہے۔ اس سے کوئی جسمانی گزند پہنچانا مقصود نہیں ہوتا البتہ اس کا انطباع گہرا ہوتا ہے۔ اس تھپڑ کو کیانی نے ایک گوندی مٹین سے برداشت کر لیا۔ ظاہر ان کی زندگی میں بھی یہ پہلا حادثہ نہ تھا۔ اگلے لمبے میں مسز ایلاس کا روئے خن اس چیز کی طرف تھا جو اس کا خاوند کھلاتا تھا۔ اس قابل احترام خاتون نے پہلے تو اسے گمری حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر اس کے بائیں گل پر ایک سنسناتا تھپڑ بٹھا کر حق زوجیت ادا کیا۔ تھپڑ کی گونج اور مضروب کی چیخ سے واضح تھا کہ یہ محض انطباعی تھپڑ نہ تھا۔ یہ ہونکا تو مسز ایلاس نے اپنا پنڈ بیک اٹھایا اور ایک حکمت کے ساتھ تھا ہونٹوں سے باہر نکل دی۔

حسینان بھرو کا ذکر بتنا جمل ہے اتنا ہی طویل ہے لیکن اس کی تفصیل سے احترازی مناسب ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں کی زندگی تھپڑوں اور بوسوں کا ایک کھٹ مٹھا مرکب تھی اور اس میں شک نہیں کہ شائے کے بے معنی اور بے رنگ دن محض اس لئے قابل برداشت تھے کہ ہر دن کے انجام پر بھرے کی با معنی اور رہنمائی شام تھی۔ لیکن ظاہر تھا کہ بھرے کے لہذا اند ہمارے قوائے عسکری پر بتدریج غالب آ رہے ہیں اور اگر ہم سے کوئی جنگی خدمت لینا مقصود تھا تو یہ وقت تھا کہ ہمیں بھرے سے نکال کر کار زار میں ڈال دیا جاتا اور یہ دن دور نہیں تھا۔

کو دیکھتے تو ان کی حیرت کو کوئی واضح نہیں نہ لگتی۔

لیکن بھرے میں بیابان پوش خواتین بھی تھیں اور قدرت کی ستم غریبی ملاحظہ ہو کہ بالآخر ہمارے دوست کو پالا پڑا تو ایک ایسی خاتون سے جس کے جوتے کی نوک میں ایک نھاسا پیار سا انٹینی واریٹ نصب تھا۔ ساتھ ہی اس سر اپنا ناز کو دھول دھپاسے بھی خاص پر ہیز نہ تھا چنانچہ ایک روز ہمارے دوست پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی اور غریب کسی پیش دستی کے بغیر اس خاتون کے ذوق لعل حملے کا شکار ہو گئے اور ہنست بھر کسی کو منہ بلکہ سر دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جوتے کا جارحانہ استعمال ہندوستانی خواتین کا ہی اختصاص نہیں بلکہ یہ حوا کی بی بی کا عالمگیر ہتھیار ہے۔ ہر حال محض جوتے کا ایک کھٹا کھٹا کھڑا کھڑا جوتہ جس سے ہمارے دوست سے جنون عشق کے انداز پھٹ چاہتا تھا چنانچہ چند ہی دنوں میں آپ کے نہ صرف بال آگ آئے بلکہ اس زور پشیل خاتون کے دل میں مرو محبت کے جھٹسے بھی اٹھنے لگے۔ آج کل جب بھی یہ میاں بیوی ہمیں پاکستان میں ملتے ہیں تو ہم شرارنا سکول کے دنوں کا مصرع سناتے ہیں۔

ع الدود پاپوش جاہاں سر پھرا سنبھلائے ہے !

لیکن حسینان بھرو کے ساتھ ہمارے تمام معاملے شادی پر ہی ختم نہ ہوئے بلکہ بعض اوقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ مثلاً مسعودیہ ہونٹوں کی وہ رہنمائی شام کہ اس کا وسیع والان حسینوں سے پر تھا اور نشست کیانی یا ایک ایک وقت روزگار پر کھڑے کھڑے دل لٹانے کو آمادہ ہو گئے۔ ہر چند کہ وہ کافرہ اس خراج عقیم کی مستحق تھی تاہم اس کا انتخاب اس اعتبار سے ناموزوں تھا کہ بیاہتا تھی اور اپنے دو لہما کے عین پہلو میں بیٹھی تھی۔ معلوم ہوا کہ عراقی نعرانیوں میں سے ہے اور مسز ایلاس کھلاتی ہے۔ اس کے دو لہما میاں اس قدر واضح طور پر بے ضرر اور تہ دل سے جیم نظر آتے تھے کہ کیانی نے انہیں ایک نظر دیکھا اور خارج از بحث کر دیا پھر اپنی جگہ سے اٹھے اور اٹھ کر مسز ایلاس کے قدم جانے اور اس سے جھٹلے میں بات کرنے کی التجا کی۔

مسز ایلاس کی زندگی میں کیانی غالباً پہلے بیماری نہ تھے جنہوں نے اس کے قدموں پر دل



"تو ذرا حبابیہ جانے سے پہلے بغداد میں تو جھانک لیں۔" وجہ کے بل سے گزر کر شارع رشید میں داخل ہوئے۔ یہی بغداد کا دل تھا اور ہے۔ وہی بصرہ کے سے تیار اگرچہ ذرا زیادہ چمکے دختران بغداد سے لگا لڑی تو محسوس ہوا کہ مقابلے میں لگا نہیں بیچ لگا ہے۔ بڑا غیر مساوی مقابلہ تھا، چنانچہ پشتر اس کے کہ کوئی سنگین واردات ظہور پذیر ہوتی، ہمارا ٹرک حبابیہ کی شاہراہ پر تھا۔

یہ وہی سڑک تھی جس پر چند ہفتے پہلے رشید علی کی حامی عراقی فوج کو انگریزوں کے ایک کاش یہ لوگ جیتنے کا کم از کم کچھ لڑ کر ہارے۔

حبابیہ کیمپ میں پہنچے جہاں ایک سمندر نما جمیل کے کنارے دسویں انڈین انفنٹری ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر مقیم تھا، یعنی پہلی منزل مقصود۔ اترے اور گرد و پیش کا جائزہ لیا، لیکن اس جائزے میں جمیل کے سوا کچھ دیکھنے نہ پڑا۔ بدھرو کیمو، جمیل ہی جمیل۔ یہ باور کرنے کے لئے کہ زمین پر کھڑے ہیں، سبز خاک کو پاؤں سے دبا پڑتا تھا ورنہ چلتے چلتے بھی یہ احساس ہوتا کہ تھر ہے ہیں۔ جمیل کے گھرے نیلے پانی میں ایک ہیبت ناک سی کشش تھی اور بے اختیار اس میں کود پڑنے کو ہی چاہتا تھا۔ یعنی اپنے آپ سے مشورہ کے بغیر۔ اور اس زخار جمیل جمیل میں کودنا شاید ایسا صحت بخش ثابت نہ ہوتا۔ چنانچہ ہم نے اپنے آپ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور لب آب سی سے جمیل کا تماشا کر کے گزر گئے۔

چند قدم ہی گئے تھے کہ وہ خیمے آگئے جو ہمیں قیام کے لئے ملے تھے۔ یہ پتہ پتہ ٹائپل سے خیمے اپنے وزن کے لحاظ سے Forty Pounds یعنی "تیس سیرے" کھاتے تھے۔ بمشکل ایک آدمی ان میں رہ سکتا تھا اور آدمی سے مراد آدمی ہے۔ وہ حضرات جو بیشتر بیٹ پر مشتمل ہوتے ہیں، اس خیمے کے لئے آدمی سے ذرا قاتلو لگتے۔ خوش قسمتی سے ایسے لوگ یہاں نہیں پہنچے تھے۔ سب شاہد کے لشکر خانوں میں رہ گئے تھے۔

بالآخر ہمیں ایک خیمہ ملا۔ بستر کھولا، ہاتھ منہ دھوا، بائٹل پنس "واش" کیا۔ کپڑے بدلے۔ اگرچہ ایک خاکی جوڑا اتار کر دو سرا خاکی جوڑا پہننا کپڑے بدلنے سے مختلف فعل

اور آخر اکتوبر میں ہمیں اچانک حکم ملا کہ فی الفور ہیڈ کوارٹر دوسویں ڈویژن میں پہنچو۔ یہ جنگ آزما ڈویژن اس وقت حبابیہ میں تھا۔ وہی حبابیہ جہاں مشہور برطانوی ہوائی اڈہ تھا۔ چنانچہ دو سرے روز شاہد اور بصرہ کو حسرت ناک سی الوداع کہی اور بصرہ کے شیشیں سے بغداد کی گاڑی لی۔ اس سفر میں ہمارے ساتھی ٹنٹسٹ پنس (Spence) تھے۔

گاڑی کے ڈبے میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ غلہ کا در کھل گیا ہے۔ ڈبہ کیا تھا، ایک رواں دواں دیوان خاص تھا۔ ٹیس اور نرم صوفے، نازک ریشمی پردے، ملائم اور گداز قالین، یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی قلعہ پلہ داخل ہوگی اور کسے گی۔

"معاف رکھئے، آپ لفظی سے آگئے ہیں، یہ کمرہ میرے لئے رکھا گیا ہے۔"

ہم نے پیچھے وطن میں بھی پہلی مرتبہ فٹ کھلی میں سڑکرتے وقت ذرا میٹھا محسوس کیا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ وہ احساس سراپا ناروا تھا اور اب کہ حقیقی میٹھا سے ہمکنار تھے، ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کیں اور اپنے آپ کو کھو دیا۔

یہ ہو چکا تو ہمیں حیرت ہوئی کہ آخر میں جنگ کے زمانے میں کہ قریب عراق کو آؤں گے لئے جوتے میسر نہیں، ان ستری رو پہلی ڈیوں کی چٹائی کیا معنی؟ اور ٹنٹسٹ پر یہ معنی لگے کہ یہ بھلا و معاً "ڈبے حکومت ایران کی ملکیت ہیں یا قلعہ پلہ و خیام کے خوش مذاق ہم وطنوں نے جرمنی سے منگوائے تھے کہ سڑکرتے وقت آپ رکنا باؤ کو ٹکشت سے کی کمی محسوس نہ ہو، لیکن گزشتہ اگست کی چند روز جنگ میں یہ مال قیمت جرمنی سے آگئے ہوئے انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اور بصرہ میں اتار لیا گیا اور نتیجہ یہ کہ وہ میٹھا جو فقط جنل حسین خاں کے لئے بنا تھا، پنس اور محمد خاں کے حصے میں آگیا۔ یہ سزا اگرچہ گھریوں میں کٹ گیا، لیکن جو گھریاں قلعہ پلہ کے آغوش میں کھیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر قیمت ہوں گی۔

دوپہر کے قریب ہماری گاڑی بغداد پہنچی، ہمیں بتایا گیا کہ باہر ہمارے لئے چند رو بندہ روڈیٹ کا ایک فوجی ٹرک انتظار کر رہا ہے۔ یہ سنا تو یوں محسوس ہوا جیسے قلعہ پلہ نے آغوش سے نکال کر پیٹ فارم پر دے مارا ہو۔ بہر حال اس ٹرک نے ہمیں اور پنس کو حبابیہ لے جانا تھا۔ (حبابیہ بغداد سے مغرب میں کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے) پنس بولے:



ہے۔ اور حبانیہ کے سینما میں قلم دیکھنے چل دیئے۔ جی ہاں یہاں فلمیں بھی تھیں، یعنی باقی تمام خرافات کے علاوہ اس لئے کہ یہاں جنگ کا زمانہ تو تھا، صرف جنگ نہ تھی۔ انگریزوں نے اس ہوائی مستقر میں ایک طویل زمانہ امن گزارا تھا، چنانچہ حبانیہ تقریبات و آسائش کے اعتبار سے برطانیہ کا تخت بلکہ تخت جگر نظر آتا تھا۔ حبانیہ کی سڑکوں پر انگریز لڑکیاں اس بیباکی سے پھر رہی تھیں گویا پکا ڈی میں محوم رہی ہوں۔ اگر فرق تھا تو یہ کہ جتنا حبانیہ برطانیہ کی نسبت گرم تھا، اتنا ہی ان دختران فرنگ کا حسن لباس کی آسائش سے پاک تھا یعنی ہر چند کہیں کہ تھا، نہیں تھا۔ بقول مجھے اس اشتعال کو برداشت کرنے کے لئے پیغمبر ہونے کی ضرورت تھی۔ ہماری پیغمبری کے متعلق کوئی Casualty و فیرو تو نہ تھی، لیکن تاریخ نگاروں نے یہ اشتعال ہم نے کمال صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

ڈیڑھ مل ہینڈ کوارٹر میں ہمارا قیام مسافرانہ تھا کہ ایک نیم فٹن کی وہاں محتاجات نہیں ہوتی۔ ہماری پکی منزل بریگڈ تھی، چنانچہ صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو ہمیں ڈیڑھ مل ہینڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا۔ میجر مینڈ نے ہمیں ۲۰ بریگڈ کے سٹیل کیمپ میں "سیکنڈ ہینڈ" کمانڈر ہونے کی نوید دی۔ ساتھ ہی تقرر کے کاغذات دیئے اور دعا اور دعا کے ساتھ ٹرک میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔

۱۔ ریل کے لئے عیار اور برکی اسٹورج

۲۔ ایک حملہ آوری کی ٹیم میں درجنوں کے بچے بھی ندا کی سہولت کا درجن ہیں۔

۳۔ امدادی کلر

۴۔ جنگل چارواں

۵۔ فوج میں کسی شخص کی فقیہانہ یا انعام کے متعلق کسی قسم کا قوری احکام ہوتا ہے (Casualty) چھپا کئے ہیں۔

## صحرائے کیارہ اور بریگڈ آفیسرز میں

۲۰ بریگڈ اس وقت بغداد کے شمال میں کوئی ڈیڑھ سو میل دور کیارہ کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ ہم نے بغداد پہنچنے پر کافری لی۔ رات سفر میں کافی اور صبح سویرے کیارہ کے اسٹیشن پر اتارے جہاں ایک اور انجیل ٹرک تھا اور انتظار کر رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے بریگڈ ہینڈ کوارٹر تک اور سینکڑوں میل ارد گرد ایک پسماندہ اور پابریہ سا صحرا تھا۔ کیارہ اگر کسی آبادی کا نام تھا تو وہ پالائے زمین نہ تھی۔ ہر طرف ویرانہ تھا۔ ظاہر تھا کہ ۲۰ بریگڈ کے لوگوں کو ان مسائل سے واسطہ نہیں جو حضرت آدم کو باغ عدن میں پیش آئے تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے سیدھا بریگڈ کے آفیسرز میں میں پہنچا۔ لفظ میں سے کسی عالی شان شہادت کے تصور کی ضرورت نہیں، سیدھا سلوا فوجی خیمہ تھا۔ اندر داخل ہوا تو تمام افسر ناشتے میں مصروف تھے۔ ہمارے رہبر نے پہلے بریگڈیئر صاحب سے اور پھر دوسرے افسروں سے ہمارا تعارف کرایا۔ تعارف ختم ہو چکا تو جس گفتگو میں ہم غل ہوئے تھے، پھر سے جاری ہوئی۔ بریگڈ کمانڈر صاحب جو ایک معمر سے بزرگ تھے، ایک نو جوان پاکستان سے یوں خطاب ہوئے۔

"پیر، تم بغداد جا رہے ہو؟"

"ہیں سر۔"

توفیق اس کی جیب یا گھٹا لٹ لیا۔ ایسی فوجوں میں قیامت کی نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے اور ایسے ماحول میں جان نثاری کی نہیں جاتی اگر ان کی جاتی ہے۔

رہا شرم و حیا کا معاملہ 'تو شرم کی وہ قسم جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ ۲۰ برس گزرنے کے بعد تک نہیں پہنچی تھی اور اس کے لئے وہ لوگ کچھ معذرت خواہ بھی نہ تھے۔ ایک تو انگریز کا حیا کا تصور ہی ہماری دیکھی حیا سے بہت مختلف ہے 'پھر رنگ کا زمانہ ہو اور کیا رہ جیسا ویرانہ 'جہاں شش جہات میں مروجی مروت تھی اور کوسوں تک کسی نسوانی گوش کے پر تو آواز ہونے کا امکان نہ تھا تو وہاں حیا کا ایک بیکار بلکہ گرانبہا کھلف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر بچا غالب کا دلی میں بیٹھے بیٹھے وضع احتیاط سے لکھ کر لگتا تھا تو صحرائیستان کیارہ کے لئے تو پاس حیا یقیناً دے کا باعث بنتا، تھوڑی سی چاک کرنا کافی ہے حیا کا تو کچھ ایسا نہ بگڑتا تھا 'لیکن ان قوم کے سرفروشنوں کی صحت بنی رہتی تھی۔

یہ شاید انہی روایات کا نتیجہ ہے کہ آج بھی فوجی افسروں کا انداز گفتار غیر فوجی حضرات کے لئے حق اور عورت ہوتا ہے اور ان کے الفاظ کا انتخاب بعض نازک طبع سولین بھائیوں کو اس شدت سے موانہ محسوس ہو کر ہے کہ وہ بات سننے کی بجائے اپنی عصمت بچانا شروع کر دیتے ہیں 'لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ یہ فوجیوں کا یہ طرز کلام ایک خاص قسم کی موانہ محفلوں تک ہی محدود ہے۔ خواتین کی موجودگی میں ان کا انداز کلام یکسر بدل جاتا ہے۔ یہ فوجی روایات کا حصہ ہیں کہ خواتین موجود ہوں تو یہ اکٹرا لوگ بے حد ریشمی اور ملائم گفتگو کرتے ہیں 'اول تو کسی کثیف موضوع کو چھیڑنا ہی خلاف شجاعت سمجھتے ہیں 'لیکن اگر کسی مقام پر بارہ و مسافر کے بغیر نہ بنے تو انہیں یہ گنا بھی آتا ہے۔ یہ احتیاط ہمارے عوام میں کسی قدر کیسا بے عام مجالس میں لوگ خواتین کے سامنے ایسے کلمات کا استعمال روا سمجھتے ہیں جو خاصے ناروا ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری خطا پوش خواتین انہیں حافظہ قرآن نہ سمجھتے ہوئے بھی پھوٹتی ہیں۔

ناشتے کی میز پر ہمارے سوا تمام انگریز تھے۔ اگرچہ تمام افسروں نے مع بریگڈیئر صاحب کے ہمارا پر تپاک خیر مقدم کیا تھا 'تاہم واحد دیکھی ہوئے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو بے یار و

"تو پھر دیکھنا شاید اس کی کوئی بہن بھی ہو۔"

"بہن تو ہے سر 'مگر"

"مگر کیا؟"

"آپ کو بیٹری سے اجازت لینا پڑے گی۔"

پیٹرنے بیٹری کا نام لیا تو ایک خوش رو پکتان قریب کی کرسی سے اٹھا۔ کمر سے جیک کر

بریگڈیئر صاحب کو سلام کیا اور بولا:

"سر 'اس معاملے میں شرکت نہیں ہوتی۔"

اس پر ایک قندہ پڑا اور خود بریگڈیئر صاحب کھٹکھٹا کر بیٹری کے پاس

آکر یہ مختصری گفتگو کسی قاری کی سمجھ میں نہ آئے 'تو یہ گفتگو کا قصور ہے۔ خود مجھ پر

اس کے رموز آہستہ آہستہ آشکار ہوئے۔ اور جب تکشف ہو چکے تو اپنے کانوں پر اعتبار نہ

آتا تھا کہ ایک صحت مند لیکن ہر حال بوڑھا بریگڈیئر نے فوجیوں اور اہل فوجیوں سے اس حد

تک بے تکلفی کی باتیں کر سکتا ہے۔ دل نادان کو طبع طبع کے سوال میں شرم گھٹا

ہے؟ حیا کیا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ضبط کیا تھا جس پر سارا فوجی نظام قائم ہے؟

ان سوالوں کے جواب بریگڈیئر میں چند دن رہنے کے بعد ہی معلوم ہو گئے۔ جہاں تک ضبط

کا تعلق ہے 'یہ میس کی بے مضبوطی صرف درون میس کی بات تھی 'میس کے باہر وہی حفظ

مراتب تھا جو فوج میں ہوتا ہے۔ سینئر کا حکم اور جونیئر کی ایک 'خواہ قہیل حکم میں جان ہی

کیوں نہ جائے بلکہ یہ کہ میس کی آزادی ہی باہمی احترام اور محبت کی ضامن تھی۔ اچھی فوج

کے سپاہیوں میں ایام جنگ میں ایک عجیب و غریب انگیزہ دوستی اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا

ہے۔ ہزار قالب مہر کی جان 'اور جہاں ماحول ایسی بے پایاں محبت کا ہو وہاں مصنوعی ضبط کا

رشتہ غیر ضروری اور بے معنی سا ہو جاتا ہے 'مگر یہ فقط حوصلہ مند فوجوں کا خاصہ ہے۔ خوف

زدہ اور گھٹت خوردہ فوجوں کا حال کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔ افسر چڑے اور اپنے رعب

کی حفاظت میں آستین چڑھائے ہوئے 'باہر سے پھرے ہوئے مگر اندر سے کانپتے ہوئے 'سپاہی اور حریف 'باہمی رفاقت کا یہ عالم کہ ساتھیوں میں سے کسی کی آنکھ چوکی 'تو حسب

انگریزیت ابھی خام تھی۔ وہ لوگ تو کپتان صاحب کو جانتے ہی تھے، ظاہر تھا کہ آج ان کی صاحب بہادری کی فرائض میرے استفادے کے لئے ہے اور وہ مجھے سبق دے رہے تھے کہ زمانہ ہمیں اپنے جیسا Native نہ سمجھو۔ تم ہی ہو تو ہو، ہم صاحب ہیں۔

اب اس خاکسار کو مرعوب ہونے میں بھی عذر نہ تھا، لیکن کچھ مصلحت چاہتا تھا کہ مہتر صاحب کا اقتدار اعلیٰ قبول کرنے سے پہلے ذرا انہیں تفصیل سے دیکھ تو لیں اور تفصیل میں کہنے تو ہمیں مہتر صاحب سے گہری ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ بات یہ تھی کہ کپتان مہتر صاحب حقیقتاً صاحب بہادر نہ تھے۔ فقط صاحب بہادری کے مریض تھے۔ ان سے الگ تیار تھا، بلکہ ان کی تیار داری کے سلسلے میں ان کی باہمداری بھی قبول کر لی، لیکن وہ اپنی دیرینہ بیماری سے شفا یاب نہ ہو سکے اور ہمارا دیکھنا ہی معاف نہ کیا۔ سال بھر میں ہم سے دو چار ہی باتیں کیں اور وہ بھی پائپ سے چھنی ہوئی انگریزی میں۔

لیکن برصغیر میں کپتان مہتر کے علاوہ اور لوگ بھی تھے اور خوش قسمتی سے مزاج کے لحاظ سے ان کی غیر مہترانہ مشاعرے اپنے پچھلے نیکش کے کپتان مہتر کے حنفی و محروم و قریب شخصیت کے مانگ تھے۔ سالہا سال ساہنٹ رہنے کے بعد آخری عمر میں افسر بن گئے تھے۔ لیکن جیسے عشق تہاں میں عمر گزارنے کے بعد مسلمانی کے انداز نہیں آتے، کپتان صاحب کی شکل و صورت یا حرکات و سکنات سے بھی افسرانہ آثار ٹاپید تھے۔ وہی سار ہشوں کا درندہ نما چہرہ اور چہرے سے درندہ تر زبان۔ آپ کی ہر بات پتھر کی شکل میں منہ سے نکلنے والی تھی۔ ذرا مزے میں آکر باتیں کرتے تو کسرا مچ جاتا۔ پاکیزہ سے پاکیزہ مضمون بھی گالی کا سارا لئے بغیر ادا نہ کر سکتے۔ البتہ گالیاں اس قدر بلیغ کہ کوئی کھا کے بے مزانہ ہو۔ یوں بھی انگریزی گالیاں ہماری گالیوں کی طرح لبادہ اوڑھے بغیر وارد نہیں ہوتیں، بلکہ خاصی ملبوس اور ملفوف ہوتی ہیں۔ کپتان صاحب کی طبیعت میں تصنع نہ تھا۔ سیدھا سادا انسان اور دوستوں پر شیدا۔ مجھے قرب خاص حاصل تھا کہ وہ کمانڈر تھے اور میں ان کا نائب۔ زندگی ایک مسلسل ہنسی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کام نہیں کر رہا، بلکہ لگاؤ مار مزاحیہ فلم دیکھ رہا ہوں۔ وہ انگریزی الفاظ جنہیں انگریز شرفاء بولنا تو کچھ سن کر بھی بدک جاتے ہیں ان کی زبان سے تقریباً جھڑتے رہتے

ہو گا محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ خیسے کے دروازے سے ایک دیسی کپتین میں داخل ہوتا ہے۔ سانولا سارنگ، باریک تیرنمای موچھ، ہال قرینے سے کٹا ہوا، ایک ہاتھ میں پائپ اور دوسرے میں اخبار۔ اپنے ہم وطن کو دیکھا تو میری آنکھوں میں جیسے روشنی سی لہرائی اور انتظار میں تھا کہ میری طرف دیکھے تو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ راز کی باتیں کہہ ڈالوں کہ خوب گزرے گی۔ لیکن بد قسمتی سے کپتان صاحب کی نگاہ مجھ پر ٹکے ہی نہ پائی اور ایک دفعہ ذرا سی پڑی بھی تو انہوں نے جیسے کھینچ کر واپس لے لی۔ کچھ حیرانی سی ہوئی کہ۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار  
یا اٹھی یہ ماجرا کیا

کپتان صاحب ٹاشٹے کے لئے بیٹھ گئے اور برصغیر کے صاحب نے ہمارا ان سے تعارف کرایا۔ لیکن کپتان صاحب نے فقط ایک لمبے کے لئے اپنی بیٹھ سے توجہ ہٹائی، بلکہ توجہ کو تو غالباً وہیں رکھا صرف اپنی ٹھوڑی کھمائی اور ایک بنائی ہوئی How Do You Do؟ کہہ کر ٹھوڑی اٹنے سے رخ کھرا کر اسی زاویے پر لے گئے جہاں پہلے تھی۔ معاف نہ ہو، وہ شہر یاد تھا جو سینہ گولڈن دن میر کی فلموں کے شروع میں ٹھوڑی کو پچھل طرف موڑ کر بجلی سی اجتماعی انحرافی لیتا ہے اور پھر سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ شاید اسی واقعہ کا اثر ہے کہ میں آج کل بھی جب یہ شیر قلم میں دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے اسے بھی کوئی برکیزد تعارف پر مجبور کر رہا ہے۔ تو فرض کر لیں کہ ان حضرات کا نام کپتان مہتر تھا۔ اب مہتر صاحب کو تعارف کی طبیعت کے اکثر ہوں، مزاج کے سکی ہوں اور گفتار کے سزبل ہوں۔ فرض ہر پہلو سے بد قبیل ہوں، لیکن بد تمیزی میں مساوات برتیں، لیکن ہوا یہ کہ مہتر صاحب نے مجھ سے تو مقدمہ کر لیا، مگر انگریزوں کے آگے وہ ہرے ہو ہو کر پھینے لگے۔ کسی سے گلد مارنگ، کسی سے ہیلو، خالص انگریزی انداز مگر ذرا کم خالص انگریزی زبان میں ہر ایک سے خیریت مزاج پوچھی اور انگریزوں کی عادت کے مطابق مزاج پرسی کے علاوہ خواب پرسی بھی کی۔ یعنی رات نیند تو انہیں آتی تھی، پھر ریگنڈیز صاحب کو مخاطب کر کے موسم پر تبصرہ کیا۔ کیونکہ ایسا نہ کیا جاتا تو آپ کی

تھے۔ ایک دن میں نے کہا:

"اگر یہ دونوں الفاظ آپ سے چھین لئے جائیں تو؟"

بولے: "بس گونگا ہو جاؤں گا" اور کیا؟"

لیکن ان کا انگریزی فقرہ اتنا سادہ نہ تھا۔

"God Al--Mighty, I Will Be--Dumb"

خالی جگہوں میں جڑاؤ کا بے نظیر کام تھا، لیکن اس کاریگری کی اردو میں نمائش مشکل ہے۔

میرے چننے کے بعد ہی کیپٹن مینسفیلڈ کا تالوہ ہو گیا اور ان کی جگہ کیپٹن شام (Shaw) آگئے۔ نارمن شام کیا آئے، کیا رو کے ویرانے میں پھول کھلے تھے۔ کیا خوش وضع و خوش اوقات انسان تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دوست بن گیا اور ہمیں دوست بنالیا۔ میرا سینئر تھا، لیکن یہ اس لئے کہ کاندھوں میں درج تھا۔ کیپٹن شام نے مجھے اس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہمارے جوان شام پر جان دیتے تھے اور وہ اسی محبت کے قابل تھا۔

برگینڈ کے دیگر افسروں کے ساتھ ہمیں ذرا کم ملاطفت تھا، لیکن رجبے ایک ہی میس میں تھے۔ گویا ایک ہی کنبہ تھا۔ دن میں کئی بار اکٹھے ہوتے اور راتیں تو اکثر میس میں ہی سحر کو دیتے۔ ولسن، بیٹری، ٹرن بل، سپورن، مارگن، شمس، جیکسن، شام اور ہمارے برگینڈ کمانڈر رابرٹس (جو بعد میں سراوگودی رابرٹس بنے) اس میس کے اراکین تھے۔ طبیعتیں سب کی جدا جدا لیکن اپنی جگہ ہر ایک بیرو۔

ان میں سے ایک کا ذکر ذرا تفصیل کا محتاج ہے۔ یہ تھے کیپٹن ہرلی۔ برگینڈ میں واحد ایٹکو انڈین تھے اور مجھ سے چند روز بعد آئے تھے، لیکن چونکہ پورے انگریز نہ تھے، کیپٹن مت نے ان کے آنے سے کئی دن پہلے ان کے جرائم کے اعداد و شمار اور بد اعمالیوں کی فہرست شائع کر دی تھی، بلکہ خمیسے کے طور پر جملہ افسروں کو فردا فردا بھی تبلیغ کرتے رہے تھے کہ ہرلی کی آمد برگینڈ کے لئے کس قدر مضر صحت ثابت ہوگی۔

ایک ایٹکو انڈین کو بدنام کرنا نبٹا آسان ہے کہ ایک تاریخی حادثے کی وجہ سے ان

لوگوں کے خلاف یوں بھی دھیمی دھیمی نفرت ہر دل میں سنگتی رہتی ہے، لہذا کسی ایٹکو انڈین کو مکمل طور پر نذر آتش کرنے کے لئے فقط ملائم سی بی جٹاوی ضرورت ہوتی ہے اور مہتر صاحب تو گویا کیپٹن جٹاوی تھے۔ پچارہ ہرلی برگینڈ میں پہنچا تو لوگوں نے ناک پر روٹل رکھ لئے، لیکن ہرلی اس بد تمیزی سے ذرا بردہم نہ ہوا اور اپنی گفتار کو روادار سے ایسی دکھل شخصیت کا مظاہرہ کیا کہ ہمارے دلوں کو جگمگ موہ لیا۔ مہتر صاحب اسے اپنی شکست سمجھے۔ اتفاق سے برگینڈ صاحب کس گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے اور ابھی ہرلی سے مل نہ پائے تھے کہ مہتر ان کی خدمت میں چاہنچا اور انہیں فی الفور فتنہ ہرلی سے آگاہ کرنے لگا۔ برگینڈ صاحب نے پوچھا:

"ہرلی میں کیا خرابی ہے؟"

مہتر بولے: "بے شمار خرابیاں ہیں۔"

"شام؟"

"ہوا کی طرح ہے۔"

"اور؟"

"شراب پیتا ہے!!"

"اور؟"

"کوہ قتل کے بجپے بھانکا ہے!!"

برگینڈ صاحب بولے: "بدا خوش مذاق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جائیں اسے کہیں، آج شام چائے میرے ساتھ پیئے۔"

یہ سن کر مہتر کو سخت مایوسی ہوئی۔ بولا:

"سر آپ کچھ ہی کہیں، میری چھٹی حس کہتی ہے کہ ہرلی اچھا آدمی نہیں ہے۔"

برگینڈ صاحب زور سے ہنسنے اور بولے:

"مہتر، تمہاری چھٹی حس تو بہت تیز ہے، مگر معلوم ہوتا ہے تمہاری باقی پانچ حسیں

خاصی ست ہیں۔ دیکھتے نہیں یا کم از کم سو گھنٹے نہیں کہ ہرلی کس قدر زندہ دل آدمی ہے؟ جاؤ"



ہمارے ہاں چھانٹے مانتے میں کیوں نہ چلے جائیں، جہاں آپ کی کمی ہے نہ دانے کی، لیکن صحرا نوروں نے کبھی تاحوں کی بات پر کان دھرا تھا جو یہ دھرتی۔ شکار کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ہندوؤں کا کھانا فقط کھجور سے باہر نکلنے کی تکلیف کرنا پڑتی تھی۔ اس کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ امیر خسرو کہیں سے آواز دے رہے ہیں۔

ہم آہوان صحرا سر خود نمازہ برکف  
با امید آں کہ روزہ بہ شکار خواہی آمد

شکار کا زمانہ آپ جہاں میں ہندوؤں کے پھنسے ہیں کہ تیسویں آہو سرکھٹ سامنے آتے ہیں۔ آپ جہاں میں پھنسے ہیں وہاں فرماتے ہیں اور وہ پیکر وقایع کے بعد دیگرے خون و عالم اپنی گردن پر لیتے آپ کی جھیل کے پانیوں میں ڈھیر ہوتے جاتے ہیں اور آپ کے اردلی اٹھا اٹھا کر دوسری جہاں میں ان کشتوں کے پٹے لگا دیتے ہیں۔ ذرا آگے چل کر آپ دھڑلے کے کنارے آگئے ہیں تو ہزاروں تیرہ سو پانچ سو آپ کے خنجر پھنسے ہیں۔ ایک ایک کر کے اس کے نہیں چھٹتے کہ انہیں معلوم ہے آپ کی آڑی ہیں اور ان با موت پر بندوں کو گوارا نہیں کہ آپ کا نشانہ خطا جائے۔

نتیجہ یہ کہ میں کے نیچے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کی میز پر غزالوں اور پکوروں کے روٹ کا ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ اگرچہ میں سے نکلے وقت یہ بلندی خاصی ہموار ہو جاتی تھی اور کیا رو کی سرخی اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا سوائے اس آتش سیال کے جس کے خم براہ راست رکٹ لینڈ سے کیا رو کے ویرانے میں لائے اور لٹھ چائے جاتے تھے۔

برگنڈ کے افسروں میں صرف میں ہی مسلمان تھا اور جب کبھی دیکھی کا گھاس لینے سے انکار کرتا، میرے سے نوش ساتھی ایک گہری ہمدردی کے عالم میں میری عموئی قسمت پر آہیں بھرنے لگتے۔ ایسی آہیں جو معلوم ہوتا تھا آسمان چیر کر نکل جائیں گی۔ جب ان صاف باطن رندوں کا کرب مجھ سے نہ دیکھا گیا، تو ایک روز جام و سکی تمام ہی لیا۔ اس پر ان سرمستوں نے اپنی شانہ دانی کے انکار کے لئے میرے گرد اس قدر دیوانہ وار رقص کیا گویا قلعہ جموں رہا ہو۔

تم بھی ایک چھوٹا دسکی پی لو۔"

کیا رو میں فوجی طور پر دست کچھ کرنے کو تھا۔ سورپے اور خندقیں کھودنا، فوجی مشقیں کرنا وغیرہ۔ اور دست کچھ کیا جاتا تھا، لیکن وہاں کی زندگی کا محور میں ہی تھا۔ وہی نیم زمین دو ذمہ جس میں چوں چوں کرتی سفری میزوں اور کیڑوں کی کرسیاں رکھی تھیں کہ اگر کسی وجہ سے برگنڈ کو اچانک دکان بڑھانا پڑے، تو خانہ بدوشی وہاں بدوش نہ ہو جائے اور یہ خانہ بدوشی ایسی غیر الملب بھی نہ تھی۔ کیونکہ ہمارے شمال میں پنج بھارے کے نواح میں بھڑکی آمد آمد تھی اور وہ کسی وقت دھار کی دوسری طرف کھڑے ہو کر ہم سے تو تو میں میں کر سکتا تھا۔ لیکن بظاہر کچھ دنوں کے لئے ہمارا قیام یقینی تھا اور ہمارا میس ہر چند کہ کچھ کاچہ پارا تھا، تاہم ہمیں یہاں وہ آرام میسر تھا جو پنج بھارے میں تو اب یقیناً نایاب تھا۔

ننانہ امن میں فوجی میسوں میں میزوں، کرسیاں، چھڑیاں، چھتے، جنگل جنگل کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی چھڑیا کاٹنا جگہ گانے میں مزاحمت کرتا تو افسروں سے ایک افسری بھیتے تھے اور بیروں، خانہ سالوں کی جان پر بن آتی تھی، لیکن ہمارے جہاں میں اس سالانہ شہرہ جگہ نہ کرتا ہو، لیکن ہم نے اسے گم کرتے کبھی نہ دیکھا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی۔ ہم نے ان گرد آلودہ کرسیوں میں سکون کے وہ لمبے دیکھے جو فوجی صوفوں کی آغوش میں بھی میسر نہ آسکے اور جب دن بھر کی فوجی مشقوں سے چور ہو کر شام کو میسوں پر آ بیٹھے، تو معلوم ہوا کہ مسلمان نے اپنی گدازباہوں میں لے لیا ہے۔

ایام جنگ میں آپ نے اپنے گھروں میں مسلمان خور و نوش کی کمی محسوس کی ہوگی وہ ہونا چاہئے تھی۔ کیونکہ اس کی میٹھی ہمارے جنگی میسوں اور لشکروں میں پڑی تھی۔ ہمیں انگریزوں سے لاکھ شکوے سنی، لیکن وافر اور متنوع خوراک کی شکل میں جو جواب شکوہ انگریزوں نے ہمیں دیا، اسے کوئی سپاہی نہیں بھول سکتا۔ پھر شاید انگریز رزق رسالوں کی دیکھا دیکھی قادر مطلق بھی ہم پر مہیاں تھا اور ہمارے گرد و پیش فراواں شکار بکیر رکھا تھا۔ عراق بیشتر صحرا ہے جہاں کھانے کو بظاہر کچھ نہیں، لیکن جتنے پندے اور غزال عراق کے صحرا میں ہیں کسی دوسری جگہ نہ ہوں گے۔ ہم سوچتے تھے کہ ان میں عقل ہو تو عراق چھوڑ کر

احساس ہوا کہ ہم تو انگریزی میں کورے ہیں۔ ہمیں بھرتی ہونے سے پہلے باز تھا کہ ہم نے شیلے اور ملٹن پنڈت رکھا ہے اور یہ کہ اور نہیں تو ہم Table Talk میں نمبر لیں گے، لیکن میز پر بیٹھے تو ہماری ساری ٹانگ ہوا ہو گئی۔ ان لوگوں سے بات کرنے یا سمجھنے میں شیلے دانی یا ملٹن منی کا کچھ استعمال ہی نہ تھا۔ بے تکلف موانہ محفلوں میں انگریزوں کی بول چال چٹ پٹے محاوروں اور خست اور کرارے بلکہ فحش اور عریاں الفاظ سے مرکب ہوتی ہے۔ ان الفاظ پر درسی کتابوں اور ڈکشنریوں کے دروازے بند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انگریزی ہمارے ~~ملاؤں اور سکولوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ فقط اہل زبان کے آگے گوش ادب واکرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے~~ ہر شب جب ہم میس سے اپنے خیمے کو لوٹتے تو دو صفیئے نئے الفاظ کے رقم کر لیتے اور اگلے روز ذرا سمجھتے ہیں ان کے استعمال پر بھی طبع آزمائی کرتے۔ اس فن میں چٹلی کے لئے بڑی ریاضت درکار ہے۔ پھر حال ہمیں اپنی لغت پر مکمل عبور تو نہ حاصل ہو سکا، لیکن گزارا اچھا خاصا ہونے لگا۔ اب کہ انگریز جاپان کا ہے، یہ الفاظ کی استعمال کی وجہ سے ڈنک ~~کوہ ہوتے ہیں اور جب تک کسی سے لڑائی نہ ہو زبان پر نہیں آتے۔~~

کیا رہ کے برگینڈ میس کی روداد پوچھیں اور یو جیم کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگی۔ پتولین ہمارے میس کا ہیڈ وٹر تھا۔ یہ ایک عریاں عیسائی تھا۔ نام تو کچھ اور تھا، لیکن قد و قامت اور شکل کے اعتبار سے بالکل پتولین لگتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کشتی نما لوہی بھی پہن لیتا، تو ہمیں شک ہونے لگتا کہ کبھی سینٹ لیتا تو نہیں پہنچ گئے۔ اسی وجہ سے کسی خوش مذاق افسر نے اسے پتولین کا شروع کر دیا تھا، لیکن اب وہ سچ پتولین ہی بن بیٹھا تھا اور اصلی پتولین کے متعلق کما کرنا تھا کہ ہاں، اس نام کا ایک اور شخص بھی گزرا ہے۔ اگر کبھی بوٹا پارٹ کہہ کر بلائے تو وہ اور زیادہ اطمینان محسوس کرتا اور ذرا اجنبیت نہ دکھاتا کہ اس طرح فراخ منہی خاندان سے رشتہ اور پکا ہو جاتا تھا۔

خود نوش کی دنیا میں کوئی معرکہ ایسا نہ ہو گا جسے ہمارے پتولین نے محض اشارے سے سر نہ کیا ہو۔ اپنے ماتحت بیڈوں پر خاص جنگی انداز میں کمان کرتا، لیکن آخر اسے بھی ایک دن اپنے وائزلو کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بھی ایک بے زبان بلکہ بے جان سے مدد راسی کے ہاتھوں۔

ہمارے میس میں پینے کے لئے پانی کا استعمال اگر ناجائز نہ تھا، تو کمزور ضرور تھا۔ ایک دوپہر کو کینٹین ولسن باہر سے تھکا ہوا آیا تو تیرا پھرتی سے ایک تازہ پانی کا گلاس بھرا لایا اور صاحب کو پیش کیا۔ ولسن نے پانی دیکھا تو ایک وحشت کے عالم میں چلا یا۔

"بندہ خدا مجھے کچھ پینے کو دو" میں وضو کرتے نہیں آیا۔"

میس سے باہر ہماری گفتار اور حرکات پر بظاہر توپ اور تفنگ چمائے ہوئے تھے، لیکن میس کے اندر ان چیزوں کا گزر نہ تھا۔ وہاں موضوع گفتگو فقط ایک تھا: عورت! اور کس بار کی اور بے باکی سے اس موضوع کو کرید اجاتا تھا! پہلے دن یہ گفتگو سنی تو عیسویوں نے ہلکا سا چپڑا کر دیا، لیکن رفتہ رفتہ کچھ ایسے عادی ہو گئے کہ نہ صرف احساس گناہ جاتا رہا، بلکہ یہ احساس بھی ہونے لگا کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ پھر زلف بازی باتیں فقط تحت التلقین ہی نہ ہوتیں، بلکہ نہایت مرصع انگریزی کمانوں میں بھی۔ انگریز نہایت دیانت داری سے انہیں Dirty Songs (گندے گانے) کہتے ہیں اور غیر مطبوعہ انگریزی کتب میں ملنا شروع ہوا، جس کا بے وقوف پاکیزہ کمانوں کا نہیں پورا انگریز بلکہ تمام بھلی اقوام کورس میں گانے کی عادی ہیں اور جس طرح کورس کی گونج مطالبِ سخن کو جلا دیتی ہے اور گانے والے کے دل و دماغ کو گرماتی ہے وہ سولویا اکیلے گانے میں پیدا نہیں ہوتی۔ جو لوگ ان دنوں عریاں ہیں تھے انہیں ایک کورس یاد ہو گا جس کی آواز اکثر افسروں کے میسوں سے سنائی دیتی تھی۔

There is Shortage Of Good Women in Erbiel

ہماری تہذیب میں کورس کے جملہ حقوق کم و بیش قوالی کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ میسوں کا ہلکا چمکا ماحول قوالی کی طہارت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ جنگ کے آخری سالوں میں جب ولسی افسروں کی تعداد بڑھنے لگی، تو ہم نے بھی محض انگریزوں کو جواب دینے کی خاطر چند نیم غلیظ ولسی کمانوں کو کورس کی فہل میں میسوں میں پیش کیا۔ مثلاً "شہر کی لونڈیا" اور "چھٹی" وغیرہ، لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو انگریزی کورس کا خاصہ ہے۔ برگینڈ میس میں سننے سننے پینے اور انگریز افسروں کو باہم باتیں کرتے سنا، تو ہمیں اچانک

پر وہ جھوٹے 'ناپتے' اور پھر دھت " ایک ہنگامہ خیزی آواز اٹھتی جو سارے کیمپ کو محیط کر لیتی۔

"تیرے لوگ دایا لشکارا تے ہالیاں نے مل ڈک لئے۔

..... اوہلے بٹے، بٹے بٹے، بٹے"

اور لمحہ بھر کے لئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم صحرائے کیارہ میں نہیں، ماٹھے میں بیٹھے ہیں۔

فوج میں ہر افسر کی خدمت کے لئے ایک سپاہی مقرر ہوتا ہے۔ جسے ریٹ مین

(Batman) کہتے ہیں۔ ہمیں سیکل مین ہر فٹ سیکھ ملا۔ پہلی نگاہ پر لباس کے لحاظ سے کچھ

ڈھیل سا نظر آیا۔ دو چادر کا کام کر دیا تو پتہ چلا کہ آپ کے دماغ کے کل پرزے بھی کچھ ایسے

کسے ہوئے نہیں۔ غالباً ہماری خدمت کے لئے اسی وجہ سے پنے گلے تھے کہ کسی فوجی استعمال

کے قابل نہ تھے۔ ہر فٹ سیکھ کی خدمات سے صرف تین دن ہی استفادہ کیا تھا کہ ایک شام آہ

دیا کرتا تھا۔ تیرے پاس آئی اور کمر کا تسوول اور سرد آہوں کے درمیان میرے سامنے

ایک مددگار دیکھ سکتا تھا۔

Your Father Hopeless Come Soon

مجھے تو اس ویسی انگریزی کا مطلب سمجھ آ گیا۔ یعنی "تمہارے باپ کی حالت نازک ہے۔

جلد پہنچو۔" لیکن ایک انگریز کی نگاہ میں یہ بنتا تھا کہ "تمہارے باپ بالکل بیکار ہے، جلد پہنچو۔"

میں نے ہر فٹ سیکھ کو لے کر کیمپن شاہ کے پاس گیا۔ کیمپن شاہ نے تار پڑھا تو سفید کاغذ پر جواب

لکھ کر میرے حوالے کیا کہ اس کے باپ کو بھیج دو۔ جواب یہ تھا:

Your Son Equally Hopeless Not Coming

"تمہارا بیٹا بھی اتنا ہی بیکار ہے۔ نہیں آسکتا۔"

1- خوارف کے موقع پر انگریزوں کا یہی جملہ مزاح اچھے ہیں؟

2- یاد رہے کہ یہ ایک طرح کی بھلی رعایت تھی، ورنہ اس کے ذمے میں ہمیں کی ہر عورت کا ذکر فوجی قوراب کے

خوارف سمجھا جاتا ہے۔

3- عقلی ترجمہ: "سیکل میں انجی عورتوں کا قوراب ہے۔" "دائل مزاح" ایک شعر ہے۔ 4- شرباب کی ایک قسم

یہ غریب مسالینی بھرتی ہوا تھا اور قسمت اسے مدراس کے کسی دور افتادہ گاؤں سے سیدھی

ہمارے بریگیڈ میں لے آئی تھی۔ اس کا اپنا نام تو کچھ انکم منگھی تھا، لیکن اسے بوجم

کہہ کر پکارتے تھے جو ایک قلم میں گونگے کردار کا نام تھا۔ ویسے بوجم گونگہ نہ تھا۔ فقط ضبط

نفس کا قائل تھا یعنی بول سکتا تھا، لیکن بولنا نہ تھا۔ وہ ہر سوال کا جواب ایک شریلی سی

مسکراہٹ سے دیتا تھا۔ اور ہندو لین کو یہ توقع تھی کہ اس کے اشارے پر گورنر جگ جائیں

اور میز پر پلیٹیں پھینے لگیں۔ بھلا مسکراہٹ سے اس کی کیا تسکین ہوتی؟

ایک رات جب بوجم کی مسکراہٹ سے پلیٹوں میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی اور وہ پلیٹیں

ہونے لگا تو ہندو لین کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ بھرا بھرا جا رہا تھا اور برساتی تھا "تانا" بوجم سے

تھم تھم تھم ہو گیا اور اسے تن واحد میں بیو نہ خاک کر ڈالا۔ لیکن منہ پر بھاگ لاتا تھا، تو

تھوڑی دیر بعد بوجم بھی اپنی ہڈیوں کو ٹوٹا اور جو تھوڑی دیر بھر کو تھم تھم کر سیوں کا سارا لپٹا

اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے ہی ہندو لین کو ایسی دل گداز مسکراہٹ پیش کی کہ اس فاتح اعظم کا پتہ پانی

ہو گیا اور اس نے غیر مشروط طور پر بوجم کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ بلکہ بوجم کو سنبھالنے سے لگا

اور اسے ایک پیار بھرا نام دیا۔ "گر موٹ" (خدا جانتے اس کے کیا معنی تھے یا نہیں، پاس پر

بوجم نے ایک اور واضح تبصیر کیا۔ اس کے بعد بوجم کا واحد کام میں کے ایک کونے میں کھڑا

ہو کر مسکراتا تھا۔ بریگیڈ کمانڈر صاحب کا کہنا تھا کہ بریگیڈ افسروں کے مورال کی تعمیر میں بوجم کی

مسکراہٹوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

ہمارے بریگیڈ کا سیکل نیشن جس کا کیمپن شاہ کمانڈر تھا اور میں نائب کمانڈر تھا، ہم

سکھوں پر مشتمل تھا اور اس کا کام بریگیڈ کے نظام مواصلات کو قائم رکھنا تھا۔ یہ کسی قدر فخر

سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے سکھ جوانوں نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا، البتہ

اس شب کی قسم نہیں دی جاسکتی جب روم (Rum) تقسیم ہوتی تھی۔ اس رات سلسلہ

مواصلات درہم برہم تو کیا، سرے سے ہوتا ہی نہ تھا۔ ٹیلی فون خاموش!! وائز لیس مرليب۔

اور ایچ بی جی انگشت بند نہ اس۔ روم نوشی کے بعد ہمارے سکھ جوانوں کو ان فرنگی کھلونوں سے

کھیلنے کا دماغ نہ رہتا تھا۔ ان کا قرار جان تو اس ڈھولک اور چنے کی آواز میں ہوتا جس کی تال

## نیم لفٹین بغداد میں

اگر فرمودہ اقبال "درست ہے کہ" "وہود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" تو یقیناً کیا رو کی کائنات سے بے رنگ تر کوئی جگہ نہ ہوگی۔ کیونکہ وہاں سے نزدیک ترین زن کا نکل وقوع کوئی سو اسیل کے واسطے نہ تھا۔ یعنی بغداد میں۔ درمیان میں سرسبز ایک خالص مردانہ صحرا تھا۔ وہاں ہمارے بریگیڈ کے افسر اپنے دل کی سپاہ خاکی دنیا میں قوموں کا سارنگ بھرنے کے لئے بغداد کی ڈیوٹی کے زمانے ڈھونڈتے یا ایجاد کرتے تو سراسر قاتل معافی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بغداد جانے کے لئے کوئی کارگر زمانہ تلاش کرنا جوئے شیر لانا تھا اور اگر یہ جوئے شیر از خود پینے لگتی یعنی بغداد جانے کے لئے کوئی جائز سرکاری کام نکل آتا تو بیسیوں رضا کار خدمت کے لئے پیش ہو جاتے۔ خدمت تو ہم بھی پیش کرتے، لیکن صرف ایک سو میں رضا کار ہی تصور ہوتے۔ کیونکہ سب سے جو نیر اور نا تجربہ کار ہونے کی حیثیت سے بریگیڈ افسروں میں ہمیں برادر خرد ہی سمجھا جاتا تھا اور برادر خرد کے لئے ایرانیوں نے ایک محاورہ وضع کر کے فریب کا بیج کے لئے ستیا ناس کر دیا ہے، چنانچہ بغداد جانے کی خواہش کا اظہار کرتا تو ہر طرف سے آوازیں اٹھتی:

"تیز سیکو، چھوٹے میاں! اس عمر میں تمہارے لئے بغداد کی سیر موزوں نہیں ہے۔"  
ایک دفعہ کسی قدر بے حیائی سے کہہ بھی دیا کہ نہ صرف موزوں بلکہ سخت ضروری ہے،



پورے چھ سو روپے انعام ملے گا۔"

ظاہر ہے اس دعوت کے قبول کرنے میں تکلف کرنا بلوفت کٹی کے برابر تھا۔ ہم نے بھلائی تمام امتحان کے لئے درخواست لکھی۔ اپنے ہم جماعت سے تصدیق کرائی اور ڈیڑھ سال بعد کوئٹہ کوئی پندرہ دن بعد ہم رشید سٹریٹ ہندو میں ہوئے قعر درجلہ کے مسمان تھے۔

امتحان کی منزل آسان نکلی۔ انگریز محقق کے پہلے سوال کا ہی جواب دیا تو قریب دونوں سو روپے کے بدلے "Too Good" گذرنا واجب سے ہی تھے لیکن یہاں سوال ہماری رائے کا نہ تھا بلکہ محقق کی ہمت کا تھا جس کی رو سے ہمارا مقام مدہ و پرویس کے قریب تھا چنانچہ فارسی زبان کے امتحان میں تو ہمیں ہار ہو گئی۔ لیکن ہندو کی زندگی کے امتحان میں کسی قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ سکول کے وقت میں الف لیلہ پڑھی تھی تو ہمارے تصور کا ہندو ایک خوابوں کی دنیا تھی۔ ہر امر اس کے عجیب انگیز۔ جہاں علی بابا دے پاؤں ملنے اٹھائے پھر دے پاؤں اٹھ کر سو گیا۔ ہم برہمن حسین کینریس رقص کر رہی ہوں۔ ایک کونے میں الہ دین چراغ رکھ رہا ہو اور کانا حجام آستین میں دشن چھپائے کھات میں بیٹھا ہو لیکن جو ہندو ہمارے سامنے تھا اس میں کوئی اسرار تھے نہ رموز علی بابا تھانہ الہ دین۔ سنے اور الف لیلہ کے ہندو میں کوئی مماثلت نہ تھی سو اسے ہم برہمن رقصاؤں کے جواب اور زیادہ برہمن ہو گئے تھے اور شاہی مٹلوں کی غلط کی بجائے کٹ کیٹ کی جلوت میں نکت لگا کر باہر چلے گئے۔

کیا رہ کی بے زن دنیا سے ہم اپنے اباؤ دل میں رنگ بھرنے آئے تھے۔ وہ بھر لیا یا یوں سمجھئے کہ ہندو نے بڑو بھر دیا۔ شارع الرشید کا وہ دوں دوں حسن کہ شوق بھی تھا اور بے قیاس بھی اور ہوئی قعر درجلہ کی وہ رنگ و بو میں ڈوبی ہوئی شینہ تقریبات کہ جہاں حسن آمادہ نموداری نہ تھا ناکس کرم بھی تھا۔ ایک واقعہ بھی نہ بھولے گا۔

سرشام قعر درجلہ کے چمن میں ایک حسین و جمیل مخلوط جمع میں ہم چند افسر اپنے مشروبات پر محو گفتگو تھے۔ کہیں شمس و سکی کے زیر اثر اپنا ہلکا فلسفہ بیان کر رہے تھے کہ

لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ اب کون تاریخ پیدا کر لکھ کر ثابت کرنا پھرنا کہ ہماری شیر خوارگی کا زمانہ گزرسے مدتی ہو چکی تھیں چنانچہ ایک عرصے تک اپنے پہلو میں درد دل دبائے بیٹھا کے تاکہ ایک روز خود قدرت کو ہماری خاطر ایک ترکیب سوچھی۔

ہوا یہ کہ ہمارے بریگنڈیر صاحب کو عربی سیکھنے کا شوق چرایا اور فی الفور ایک عراقی ٹیوٹر منگایا گیا۔ ٹیوٹر نے اپنے گزشتہ تجربے کی بناء پر بریگنڈیر صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر عربی سیکھنے میں آپ کا ایک ساتھی بھی ہو تو دونوں شاگردوں کا بھلا ہو گا۔ بریگنڈیر صاحب کے ہم جماعت ہونے کا قعر ہمارے نام پڑا۔ ایک سینکڑہ لکھنؤ کے لئے ایک بریگنڈیر کا ہم سبق ہونے سے بڑی کوفت کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن بر نور دار جو تھے دھڑلے گئے۔

خیر جب تعلیم شروع ہوئی تو بریگنڈیر صاحب بڑے مفید ہم جماعت بن گئے معلوم ہوا کہ پانچ چھ یورپی زبانیں جانتے ہیں بلکہ زبانیں سیکھنے کا انہیں چکا ہے۔ آپ امیران کے مختصر سے قیام سے تھوڑی سی فارسی بھی جانتے تھے لیکن عربی بول چال میں ابھی مقدار زیر پری تھے۔ اور ہم نے کالج میں صرف فارسی پڑھی تھی۔ عربی کو درساؤں میں پڑھی تھی تاہم باقی مسلمانوں کی طرح (یعنی نیڈی مسلمانوں کو چھوڑ کر) عربی پڑھنا ہمارے ذہن کا محض قاتل اور عربی لکھنا ہمارے دائیں ہاتھ کا اور دونوں باتھیں سے کوشش کر کے کچھ مطلب بھی نکال سکتے تھے چنانچہ پہلے روزی جب عربی کتاب فر فر پڑھ کر لکھ کر بریگنڈیر صاحب حیران رہ گئے اور استاد محترم تو پھر ک ہی اٹھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے عربی دانہ کی وجہ ہماری مسلمانی ہے تو آپ نے خوش ہو کر حلق کی گمراہی سے ایک بل کھائی ہوئی لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر ہم نے بھی ہر ملک اللہ پیش کی ہو اپنے وطن میں تو چمک مارنے کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن اس موقع پر بھی خاصی منفائی سے چمک گئی۔ امتیازاً ہم نے ایک بلکی سی مصنوعی چمک بھی چمک دی کہ ان مقدس تراکیب کے ٹیکنیکل استعمال کی صحت بھی برقرار رہے۔ باتوں باتوں میں بریگنڈیر صاحب ہم سے فارسی میں سوال کر بیٹھے۔ ہمارے منہ سے محض اتفاقاً ایک چست سا جواب نکل گیا۔ بریگنڈیر صاحب مرعوب ہو کر کہنے لگے۔

"ارے تمہاری تو فارسی بھی بڑی "مضبوط" ہے۔ ہندو جا کر امتحان کیوں نہیں دیتے؟"

رقص۔

رقص کے معاملے میں ہر ملک کا اپنا مذاق ہے۔ ہندو پاکستان میں رقص کے عناصر چشم و ابرو کے اشارے اور دست و پا کی حرکات ہیں اور جس قدر نزاکت ان چہرہ و سر میں ہو رقص اتنا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے عربی رقص کا پہلا لازمہ عریانی ہے اور دوسرا کولہوں اور چھاتیوں کی جنبش۔ عریانی جس قدر دوسرا اور جنبش جتنی طوفانی ہو۔ رقص اتنا ہی لاجانی تصور ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے جب ایک عراقی رقص کو تقریباً گیارہ سو کے بغیر دیکھا تو ہلکے سے ہنسے اور جب معاملہ بننا نیدن تک پہنچا تو پاور نہ آتا تھا کہ بھری محفل میں یوں بھی ہو سکتا ہے، لیکن گویا اور ہم دیکھا کہ۔ پہلے ذرا کافی آنکھ سے پھر جیسے کتاب پڑھی جاتی ہے اور وہ جسے ذوق سلیم تھے ہیں اس مدد جزر کی نذر ہو گیا جو ان رقصاؤں کی سینہ زوری سے پیدا ہو کر تماشاویں کو لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ہمیں کٹ کیٹ اور ملٹی الف لیلہ میں وہ بات نہ ملی جو ہندوستان کے مسلمانوں میں تھی۔ ہمیں اپنے وطن کے رقص اور عربی رقص میں وہی فرق محسوس ہوا جو ستر نوازی اور ڈھول بجانے میں یا گھاپ اور گوبھی کے پھول میں ہے، لیکن یہ ہمارا نقطہ نگاہ ہے۔ ممکن ہے عرب حضرات ہمارے لطیف اور مزید رقص کو دیکھیں تو کہیں۔ ”کیا وہ ایسا چیز ہے کہ کوہا ہوتا ہے نہ چھاتی پھرتی ہے“ یہ تو مساکین اور بتائی کا رقص ہے۔“

مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا ہمارے دلوں میں پیدائشی احرام ہے، مگر ان ممالک میں جا کر یہ احرام ذرا ڈگمگائے لگتا ہے۔ اس میں قصور دراصل عربوں کا نہیں ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے انہیں محض عرب ہونے کی وجہ سے تقدیس کی روٹی میں لپیٹ رکھا ہے اور ان سے سوائے اس کے توقع ہی نہیں رکھتے کہ صبح انہیں وضو کریں اور دن بھر اذانیں دیتے رہیں یا نفل ادا کرتے رہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ عرب بھی ہماری طرح گوشت پوست کے انسان ہیں اور سینے میں دل رکھتے ہیں۔ جو وقت ”فوق“ بھر بھی آتا ہے بلکہ جغرافیائی مجبور یوں سے کچھ زیادہ ہی بھر آتا ہے۔ گویا دل کے معاملات میں عرب بھائی بالکل ہماری طرح ہی ہے بس ہیں اور ان سے تھوک نیکیوں کی توقع صریح زیادتی ہے۔

یہاں ہر عورت کی کچھ قیمت ہے اور ہم اس سوئچ پر لعنت بھیج رہے تھے کہ باہر سڑک پر ایک کیڑی لاک کار کی۔ شو فرنے اوپ سے دروازہ کھولا۔ اندر سے دو وجہ اور باوقار خواتین برآمد ہوئیں۔ ہوٹل کے غلاموں نے جبک کر سلام کیا۔ معلوم ہوتا تھا کسی بیٹے گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ چلیں تو ایک واضح حکمت اور شان سے۔ آخر ٹیرس کی کوئے والی میز پر جا بیٹھیں۔ ہم نے شمس سے کہا:

”اب کہو تمہارا گستاخ کلیہ ان معزز خواتین پر بھی حاوی ہے؟“

بے لگام شمس کو بھی ہل کیے کی جرات نہ ہو سکی۔ ایک شکست خوردہ سہانہ لہجے میں فرمایا: ”ہم نے شور مچایا۔“ ہار گئے۔ ہمیں Drinks پلاؤ۔“ شمس نے سر تسلیم خم کیا۔ مزید مشروبات کا آرڈر دیا اور آرڈر دیتے ہوئے بیرے کے گلاس میں کچھ دیا۔ بیرے نے جاتے ہوئے ان خواتین کا بھی آرڈر لیا اور کچھ دیر کے بعد گلاسوں سے بھری ہوئی ٹرے لے آیا۔ ہمارے سامنے گلاس رکھے تو شمس کے سامنے گلاس کے علاوہ ایک کانڈ کا پرزہ بھی رکھا جس پر زباناں پاتھ سے لکھا تھا: ”عشروہ ثانیہ“ (دس دن کا)۔ اب شمس کا پہلا اور جائز مطالبہ یہ تھا کہ گلاس پر پانچ کرکھڑے ہو جاؤ اور جبک کر سلام کرو۔ اس پر ہم نے خوشی سے عمل کیا۔ اس کا وہ سحرور ذرا کم جائز مطالبہ یہ تھا کہ ہفتہ بھر اپنے پیروں سے وہی پلاؤ۔ اس پر ہم نے تسلیت یا آواز نہ دینے کا اہتمام کیا۔ لیکن ہر حال عمل اس پر بھی کرنا پڑا۔

سو ہم چاہتے تو اپنی بلیک اینڈ وائٹ زندگی کو عمل طور پر ٹیکنی کلر میں بدل دیتے لیکن یہی بات ہے ہم اتنے شہ رخ رنگوں کی تاب نہ تھی اور ہر حال اس مال فروخت میں وہ کشش نہ تھی کہ ہم دولت دل مع ذیلی الاؤنس ان کے آگے ڈھیر کر دیتے، لیکن یہ کہتا بھی ریا کاری ہوگی کہ ہم نے قصور جلد کے حادثے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی اور قیام بغداد کے باقی ایام فقط یاد خدا میں گزار دیئے۔ ہمیں گزارش احوال واقعی منکور ہے اور وہ یوں ہے کہ ہمارے ایام بلکہ راتوں کا بیشتر حصہ کٹ کیٹ اور ”ملٹی الف لیلہ“ کے گرد و پیش ہی گزارا جو وہاں کے مشہور کیرے تھے، اگرچہ وہاں بھی ہماری کشش کا مرکز اپنے وطنی افسروں کی صحبت تھی نہ کہ عربی

البتہ ایک معاملے میں عرب ہم سے بہت آگے ہیں اور وہ ہے قرأت 'عرب قاری کی آواز میں ایک جاوہ ہے اور لے میں ایک سحر' ہم نے جب بھی عربوں کی زبان سے قرآن سنا وہ ہم میں آگئے۔ لیکن ایک معاملے میں عرب نہ صرف ہمیں وہد میں نہ لاسکے بلکہ الٹا پتھر میں ڈال دیا اور یہ تھا ان کا طریقہ نماز۔ ایک دفعہ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ بظاہر حق تو نماز ہی لیکن عجیب فری سٹائل (Free Style) کی عبادت تھی۔ عید کا دن تھا اور براہِ عزیمت مصر ہوئے کہ بصرہ مسجد میں جا کر نماز عید ادا کریں گے۔ پہلی مسجد کے دروازے پر پہنچے تو قفل پڑا تھا۔ خانہ خدا اور مقفل؟ "پلو۔ کوئی مصلحت ہوگی۔ دوسری مسجد میں گئے۔ شہر سے کچھ دور تھی۔ وضو کر کے اندر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ نماز عید باجماعت تھی۔ کچھ قزاقی قزاقی جاری ہے۔ حیران ہوئے لیکن کما "پلو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔" یہ دیکھ کر البتہ خوشی ہوئی کہ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شریک نماز تھیں، لیکن اس کے بعد ہم نے کچھ ہوتے دیکھا اور اسے دیکھ کر ہماری خوشی پہلے حیرت اولہ پھر وحشت میں بدلنے لگی۔

ابھی ہم نے نماز شروع نہ کی تھی کہ نمازی عید کے درمیان میں کچھ قرأت ہے 'تکلفی سے ہمیں سمجھ گئے۔ کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اصغر کو اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھتے جا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ہم سے بیچتے مزاج بھی پوچھتے ہیں، لیکن شاید "آمین" تک پہنچ گئے تھے۔ اچانک منہ خانہ کعبہ کی طرف کر گئے، کعبہ میں چلے گئے۔ میں ابھی اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اصغر بولے۔ "اوھر دیکھو" اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھی سی خاتون نے جو اہتمام میں ہیں 'وائس ہائٹھ کی انگلیوں میں ایک سنگ مرمریت تھام رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً "نماز تملی بخش سائش لگاتی ہیں اور خانہ خدا میں نیلے دھوئیں کے مرفوے اور عرا میں قہیر کر رہی ہیں۔ حیران تھے، لیکن کیا کہہ سکتے تھے سوائے اس کے کہ

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر

نماز پڑھی اور باہر آگئے۔

ڈکر بغداد کی تفریحات کا تھا۔ زمانہ جنگ میں افلاق کے بندھن کسی قدر ڈھیلے ہو جاتے

ہیں اور بغداد کا ماحول بھی افلاق صحت کے لئے ایسا سازگار نہ تھا، بلکہ دل و نظر کا سینہ سنبھالنے کے لئے غاسی کوشش کرنا پڑتی تھی۔ ایک ایسی ہی کوشش ہمیں بغداد سے نکل کر نجف و کربلا لے گئی۔ ہوئی میں ساتھ کے کمرے میں ایک اور سینڈ فٹسٹ ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بھی ساتھ ہوئے۔ کربلا پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مختلف مقامات دکھائے ہم دونوں نے فوجی دروایاں پسلی ہوئی تھیں۔ فوراً باقی زائرین خصوصاً بچوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ بدھ جاتے، ایک چھوٹی سی فوج تعاقب میں ہوتی۔ معلم نے انہیں بھگانا چاہا، لیکن انہوں نے کچھ زبان ہو کر کچھ عربی آوازیں نکالیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں یہ فوجی میں لاہوری "اوسے اوسے" کا کھڑی کورس نہ شروع کر دیں۔ معلم کو ٹوک دیا اور تعاقب کنندگان سے مصنوعی خندہ پیشانی سے اٹھنے لگے۔

پانا آخر حضرت امام حسینؑ کے روضے میں داخل ہوئے جہاں نہ صرف ان لوگوں سے ڈانٹ لی گئی بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے تمام فوجی و روحانی آکاشوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ فاتحہ پڑھی اور درجہ تک تعمیر کی جالی تھامے کھڑے رہے۔ یہ مقام ہے جہاں آنکھیں تر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

کربلا سے نجف پہنچے۔ یہاں کا ماحول کسی قدر مختلف تھا۔ یہاں ہندوستانی مسلمان غاسی تعداد میں تھے، مگر اکثر غریب اور بیمار۔ روٹنے سے ایک فاصلے پر ٹیکسی سے اترے، فوراً ایک ہندوستانی صاحب گھر سے اور میرے ساتھی کو جعدار صاحب کہہ کر سلام کیا۔ اپنی نشینی کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں مسمار ہوتے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں ٹون اتر آیا۔ غریب کو بازو سے پکڑ کر کہنے لگے:

"او بھگ سنگ! تو نے بیک جنبش لب مجھ نخل سینڈ فٹسٹ کو جعدار بتا دیا۔ تمہاری یہ کہاں؟" اس کے بعد آپ نے اسے لٹھا انگریزی میں چند گالیاں دیں جسے اس نے صحیح سمجھ کر برا مانا کہ نشین صاحب کی نیت بہر حال صحیح گالیوں کی تھی۔

حقیقت میں سائل پتھارے کا تصور نہ تھا کہ ان دنوں جعداروں اور نشینوں کے کندھے کے نشانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں ایک سے دھیل کے ستارے لگاتے تھے۔ اور تاج کل

مجھے تو شاہ صاحب نے ہمیں روٹنے کی زیارت کی اجازت بخش دی۔

الغرض جب واپس بغداد پہنچے تو آدھی رات کا عالم تھا۔ نشین صاحب نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے تجویز فرمایا کہ کاٹھن کی زیارت کی جائے۔ ارادہ تو ہمارا بھی تھا، لیکن ان کی رفاقت کا شوق سرد ہو گیا تھا، لہذا امر کالی سے عذر کر دیا۔ دوسرے روز کاٹھن پہنچے تو آگے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ معلوم ہوا دو آدمی قسم قسم تھا ہیں۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو فریقین میں سے ایک ہمارے نشین صاحب ہی تھے۔۔۔ اس کے بعد ان نشین صاحب کو آج تک نہیں دیکھا۔ حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ شاید ادھر ہی ہوں، ہر حال جہاں ہوں خدا انہیں خوش رکھے۔ اگرچہ اصل معاملے میں وہ خدا سے تعاون کرنے والے نہ تھے۔

آخر ہمارا بغداد کا قیام ختم ہوا واپس کیا رہ بیٹھے تو بریگزٹ موصل کو کوچ کر رہا تھا جو پچاس میل شمل میں تھا۔ گویا پچاس میل اور بظہر کے قریب اس نقل مکانی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شمل سے بظہر بھی اسی قدر ہموار ہے۔ بظہر جانے کی زحمت اٹھا رہے ہیں اور چونکہ ملاقات کا امکان صاف تھا، معزز مسافر کو بغداد تک نہ کرنا لازم ہے۔

موصل پہنچے تو تفسیر زمیں اور چند چٹخرا افسروں کے لئے موصل شہر میں عمارت مل گئی۔ باقی سپاہیوں اور ہم جو نیوز افسروں کے شہر سے چند میل باہر خیمے گاڑے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جتنی جگہ خیمہ گھیرتا ہے اسے دو تین فٹ گھرا کھود دیا جاتا تھا۔ اس سے ایک تو گمرانی کے سبب خیمے کے اندر چلتا پھرتا آسمان ہو جاتا تھا اور دوسرے اندر بیٹھے یا لیٹے ہوئے دشمن کی گولی کا گر نہ ہوتی تھی۔ دن بھر سپاہیوں کے ساتھ کام کرتے، لیکن کھانے کا وقت اور خصوصاً شام میں میں گزارتے یا موصل کی گشت کرتے جہاں وہی بصرہ و بغداد کے رنگ تھے، لیکن ذرا شہر۔ رات ہر حال یکپ میں آجاتے۔

ایک رات اس زور کی بارش ہوئی کہ بغول فٹے سات آسمان گر پڑے۔ ذرا بادل چھٹے تو رات کے دو بجے کچھ سے لت پت میں سے یکپ پہنچے۔ آگے خلاف معمول ہمارا اردلی سکتل میں ہر نفس سنگھ انتظار کر رہا تھا۔ فریب ہڈیوں تک بارش سے بھیگ چکا تھا اور اچھا خاصا چراپوٹی بنا کر اٹھا۔

کا امتیازی فیہ جمعہ اوروں کو نہ ملا تھا، چنانچہ نشین صاحب کو بہت سمجھایا، لیکن نہ مانے۔ کہنے لگے:

”بعد از چہڑی باندھتا ہے میرے سرافرانہ ٹوپی ہے، کیا یہ اندھا ہے؟ چہڑی اور ٹوپی میں تمیز نہیں کر سکتا؟“

ذرا ہنس کر عرض کیا: ”معاف کر دیں فریب کو ذرا بھیگا ہے شاید Optical Illusion کی وجہ سے لٹلی کر گیا ہے۔“

بولے: ”گویا تم بھی سائنس کی مدد سے میری ہنگ کرتے ہو۔“  
اب معلوم ہوا کہ قبلہ نشین صاحب بھی ذرا دماغ کے پیچھے ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا اور آگے روٹنے کی جانب بڑھے، لیکن نشین صاحب رک گئے اور کہنے لگے: ”امیر المؤمنین کے روٹنے میں جانے سے پہلے خیرات باغنی لازم ہے۔“

آپ سیدھے۔ میں سمجھا ان رموز سے واقف ہیں، چلو، نشین خیرات باغنی دے۔ آپ نے جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا اور اپنی ہندوستانی دہان سے سرب ذرا بھینچ کر دیکھ کر دہان میں حکم دیا کہ اس کی ریڑ گاری لے آؤ، تاکہ فریاد میں تقسیم کر دی جائے۔ ذرا تیر نے دل میں ہندوستانی انگریزی کا عملی ترجمہ کر کے سمجھا کہ اسے خود ہی دینار بھنا کر فریاد میں تقسیم کرنا ہے۔ فریاد کی دہان کوئی کمی نہ تھی۔ ذرا تیر پانچ منٹ میں اس کا رخیر سے فارغ ہو کر آیا۔ نشین صاحب بولے:

”اچھے کہیں کے ہمارے ساتھ دھوکا؟ جاؤ جن جن فریبوں کو خیرات دی ہے، ان سے واپس لاؤ، ہم اپنے ہاتھ سے پائیں گے۔“

ذرا تیر سمجھ گیا، سواری عقل سے عاری ہے۔ جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا، اپنے سر پر پھیرا اور چوم کر قبلہ نشین صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نشین صاحب کے شور و غل سے ہیکاری تماشے کی خاطر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس گھما گھمی نے خیرات کو تقسیم انعامات کی تقریب بنا دیا۔ آخری چہرہ قسم ہو چکا، تو جناب نے خلبہ صدارت دینا چاہا، لیکن خوش قسمتی سے ہیکاریوں نے اس میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور جب سامعین میں فقط یہ خاکسار اور ذرا تیر رہے



میں نے پوچھا: "اتنی رات گئے انتظار کی ضرورت؟"

بولاً: "صاحب! وہ گم ہو گیا ہے۔"

"کیا گم ہو گیا ہے؟"

"آپ کا تنبو!؟"

"تنبو کیسے گم ہو سکتا ہے؟"

"جی اڑ گیا ہے۔ طوفان جو آیا تھا۔"

"اور ہمارا سامان؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"یعنی؟"

"خیرے! گزرا پانی سے بھر گیا ہے اور زمیں کے ساتھ ہموار ہو گیا ہے۔ صبح ڈبکی لگا کر دیکھوں گا۔"

"جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تم کیا کر رہے تھے؟"

"جی میں دیکھ رہا تھا۔"

ہرنس سنگھ اس "دیکھتے رہنے" کی وجہ سے اپنے آپ کو شاپاش کا صحن سمجھتا تھا۔ اسے شاپاش دی اور حق تو یہ ہے کہ حق اوانہ ہوا۔ رات واپس میں شاپاش جاکر اودھار کے بستر پر گزاری۔ صبح کیمپ میں آئے تو ہرنس سنگھ لنگھنے میں لمبوس شکر لگا ہوا آگے بڑھا اور

بولاً:

"صاحب! آپ کی لوہے کی کرسی خیرے کے گڑھے میں سے مل گئی ہے۔" میں نے کہا:

"شاپاش! اور باقی سامان؟"

ہرنس سنگھ کی مسکراہٹ ذرا اکملانے لگی۔ بولاً: "صاحب! باقی سامان تو دھبے میں پہنچ گیا ہے۔"

۱۔ دورانہ بہت

۲۔ بکرہ ہوا منہ میں "ان کل کبیر" نامی لکھتہ اقدار کے شیر نامیات ہیں۔

۳۔ رعب نگر

## موصول سے طریق ○ پندرہ سو میل کا سفر

ہماری نگاہیں موصل کے شمال میں کاکین کے پہاڑوں پر جمی تھیں۔ کیونکہ اسی راستے پر ہٹلر کی آمد کی خبر مکرمل تھی اور اس خیال میں ہمارے برگینڈے گمر کے تمام پورے بچھار کے تھے جی جی جس میں ایک برگینڈے کی بھانجری تھی لگادی تھی۔ اودھ ہٹلر کا لشکر کئی ڈویژنوں پر مشتمل تھا اور کہا جاتا تھا کہ اگر وہ ہٹلر اودھ لنگھتا تو ہمارے برگینڈے پر ڈسے اڑیں گے۔ ہم اس کے لئے بھی تیار تھے لیکن بالآخر یہ قیامت نہ ہو اور ہوا یہ کہ عین اس وقت کہ ہم ہٹلر کی خبر آزمائی کے لئے موصل کے قریب میں منتقل آراستہ کر رہے تھے اس کی نگاہوں کے کنٹن بدوشوں پر بڑی اور غلام نے ان کے مقابلے میں ہمیں قاتل القات نہ سمجھا۔

واہر نا کر! یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ

ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

اب ہم اس خیال سے نڈھال ہونے لگے کہ شاید موصل میں ہی بیٹھے بیٹھے بے معرفت بوڑھے ہو جائیں گے اور سوچ ہی رہے تھے کہ اب کہاں قسمت آزمائے جائیں کہ اچانک شمالی افریقہ کے صحرائے اعظم سے ایک نئے ہتھیار آزمائی یعنی جنرل رول نے ہمیں یاد کیا۔ اس وقت رول مغرب سے مصر کی طرف بڑھ رہا تھا اور بن غازی کی گوشمالی اور پھر اشک شوقی کرتا ہوا اپنی دور مار توپوں کے ذریعے طریق کی ابتدائی مزاج پر ہی کر رہا تھا لیکن پھر اس کے کہ

اہل طریق کوئی مناسب جواب دینے کی ہمت کر سکتے ہمارے برگینڈ کو حکم ہوا کہ موصل سے طریق پہنچو، یعنی کوئی ذیادہ ہزار میل مغرب کو چنانچہ فی الفور ایک طویل سفر کی تیاری ہوئے گئی۔

نقشہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ موصل سے فلسطین کے ساحل تک پانچ لاکھ ہماری رفیق سفر ہوگی اور اس سے آگے سرسبز کے پار افریقہ کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ ساحلی سڑک۔ گویا تمام تر راستہ صحرا سے گزرنا تھا اور اس طویل صحرائوردی کے انجام پر کوئی جلی نہ تھی بلکہ رول!

۵ مئی ۱۹۳۶ء کو موصل سے کوچ کیا اور جنوب میں پہلے سے سڑک میل اور عربی کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔ یہاں ہفتہ بھر ٹھہر کر بغداد کے نیا ساز و سامان اور اسلحہ و بارود حاصل کیا اور سفر طریق کی تیاری کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سفر آخرت کی تیاری ہے۔ کیونکہ رول سے کسی بہتر سلوک کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ پھر حال ۲۲ مئی کو ہمارا ۱۲ روزہ صحرائی سفر شروع ہوا اور علی السبب برگینڈ کی سیکڑوں مختلف اشیاء کا انبار اور سامان سے لدن ہوئی ایک خاص ترتیب سے سڑک پر لٹیں اور کارواں مغرب کو روانہ ہوا۔

کارواں میں سفر کرنے کے آداب قاصد سے سمجھے جاتے ہیں۔ گاڑیوں کی رفتار اور ان کے درمیانی فاصلے مقرر ہوتے ہیں۔ کیا بھال جو کوئی ڈرائیور کیلئے جاتی میں اپنے پیش رو سے آگے نکل سکے؟ کوئی یہ لٹھی کرے تو پانچین اس کے پر جمل جانے کا اندیشہ ہے کہ امیر کارواں میں نہیں خوشے دلخوازی! اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے کیونکہ اگر وہ ہر کارواں حکم کی دلخوازی کرنا پھرے تو پھر کارواں کا اٹھ حائط اور ایسے بگڑے ہوئے کاروانوں کی حفاظت اللہ کی عادت نہیں۔ کارواں سے ٹوٹنے کا نقطہ ایک ہی جائز ہمان ہے کہ چلتے چلتے آپ کی گاڑی کا انجن جلا جاتی ہو جائے لیکن ایسے انجنوں کا مسیحا بھی کارواں کے ساتھ ہی چل رہا ہوتا ہے۔ اسے غیر دینی زبان میں بریک ڈاؤن لاری کہتے ہیں۔ اور اس کی ایک چھوٹک مراد انجن کو مہار قناری پر تباہ کر دیتی ہے اور اگر چھوٹک کا مرکز نہ ہو تو نہ سہی مرگ عاشق یوں بھی بے معنی چیز ہے اور اس مسیحا کو اپنی بات جانے سے کوئی غفٹ بھی نہیں ہوتی۔ مرحوم کو سر نہ چھوڑتے

ہوئے باقی کارواں مع مسیحا رواں رہتا ہے۔

کوئی چار بجے کا وقت تھا کہ ہمارا کارواں مجور کے مقام پر رات کے قیام کے لئے رکا۔ مجور اکیلا تھی ہمیں نظر نہ آئی۔ لٹ و دق صحرا تھا۔ دشمن کے ہوائی جہازوں کا ایسا خطرہ تو نہ تھا لیکن کارواں سالار نے مور پے کھودنے کا حکم دے دیا اور کھلے میدان میں سرکٹ پیچنے یا روشنی کرنے پر پابندی لگا دی۔ زندگی ختم کرنے کے لئے یہ چھوٹی چھوٹی پابندیاں بڑی پابندیاں سے کہیں زیادہ ظالم ہوتی ہیں۔ سر حال جائے اعتراض نہ تھی۔ دن کا کھانا ہم نے چلتی گاڑیوں میں ہی کھالیا تھا لیکن اب باقاعدہ مین کا خیمہ نصب ہوا۔ میزیں لگائی گئیں انگریزی دستور کے مطابق کھانا چنا کھانا کیا گیا اور مشروبات نوش کئے گئے۔ فوجی زندگی کا یہ قریب بے حد دلکش ہے۔ اس زندگی میں جفاکشی بھی قیامت کی ہے لیکن ان جہازوں کے درمیان اگر ایک لمحہ فرصت کا میسر ہو یا دشمن مملت دے تو کام طرب آراست ہو جاتی ہے۔

یہ لکھتے ہوئے برگینڈ فریڈلے Fiedley کا واقعہ یاد آتا ہے۔ قبائلی علاقے کے سلسلہ کوستان میں فوجی حلقوں میں تھے کہ چارو یا چار ایک رات پہاڑی دندائے در و ڈھلان پر گزارنا پڑی۔ خیال تھا کہ یوحی کسی چٹان کے نیک لگا شرب عمر کریں گے کہ برگینڈ فریڈلے کو اپنا بستر اپنے ہاتھ سے کھولتے ہوئے دیکھا اور بے حد حیرت ہوئی کیونکہ برگینڈ صاحب صرف تین چوتھائی اصلی تھے اور باقی مصنوعی یعنی آپ کی ایک ٹانگ اور باؤ چوٹی تھے۔ اصلی اعضاء ایک جنگل کے علاقے میں ضائع ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے آپ نے پہلے چارپائی کے برابر بستر بچھا کر لی پھر سفری چنگ لگایا بستر بچھایا سفری میز اور کرسی لگائی۔ میز پر بیکری بولٹ اور گلاس رکھے اور ایک سکون کے عالم میں سے نوشی شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے سامنے ایک نوٹے پھوٹے برگینڈری کے بجائے کوئی جوان سال شاعر بیٹھا ہے جس نے انتہائی سنگھار زمین میں ایک گفتہ غزل کہہ ڈالی ہے۔

جب برگینڈ صاحب نے ہمیں دیکھا کہ سوالیہ نشان بنے بیٹھے ہیں تو بے اور سننے لگے:

Any Fool Can Make Himself Uncomfortable

برگینڈ صاحب کی چوٹ سے ہمارے سالم دست و پا حرکت میں آگئے اور منتوں میں

پانچویں روز اچانک ایک دریا نے ہمارا راستہ کاٹا، پہل سے پار ہوئے تو ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئے۔ حد نگاہ تک ایک وسیع سبز و زار پھیلا ہوا تھا۔ معاً ہماری نگاہ ایک پک تک کرتی ہوئی ٹوٹی پر پڑی۔ انہوں نے ہمارا کانوائے دیکھا تو ہماری طرف لپس۔ ایک نہیں، دو نہیں، پوری سات دو شیرائیں! خدا جانے ان بنات النسل کے جی میں کیا آئی کہ دن و رات سے عریاں ہو گئیں۔ یعنی تقریباً عریاں! پیرا کی کالاس پہنے ہوئے تھیں۔ اور ابھی بیکلی بیکلی دریا سے نکلی تھیں۔ ہم نے انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے بعد چرخوں میں روشنی نہ رہی! ہم نے دیکھا کہ کچھ تو خیر انہیں کیا حاصل ہوتا تھا، لیکن ہم سکتے ہیں آگے۔ ہمارا کارواں دیکھا گردش شام و سحر رک کی حالتوں کی سات سرودہ، آہو چشم اور سرمرس بدن۔ اس قدر دلربا جیسے غالب کی غزل 'اسے دیکھو کوئی سیاہ رخ پر پریشان کئے ہوئے۔ اسے دیکھو تو سرے سے تیز دشن مڑھیں کئے ہوئے' اور وہ جو ذرا اچھے کر مسکرا رہی تھی، چہرہ فروغ سے گھٹیں کئے ہوئے اور ہم کہ مدت ہوئی تھی پار کو مچھل کئے ہوئے۔ جگر تخت تخت سے دعوت مڑھیں کرتے تھے۔

بعد میں سنا کہ ہمارے سالار کارواں میں اس حسن کی یلغار کے آگے تھوڑی دیر کے لئے سالار سے انسان بن گئے اور جب روک کر انہیں پلو کہا اور پلے تو ایک مدت تک بیچھے باکا کئے۔ جب مقامی لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایک سے بڑھ کر ایک نو بہار ناز کون ہے، تو معلوم ہوا کہ دختران یسودہ ہیں اور یہ کہ ہم دریائے اردن عبور کر کے فلسطین میں داخل ہو چکے ہیں۔

فلسطین کی افغان کشمیر یا سوات سے مشابہ ہے۔ انگریز اسے دیکھتے ہی ہوم یاد کرنے لگے اور ہمیں تو صحرائے عراق کی ریت اور لادے کی درشتی کے بعد فلسطین کا سبز و بویں محسوس ہوتا تھا کہ زیر پاؤں پر نیاں آمد ہے! چھوٹی چھوٹی یسودی بستیوں سے گزرتے تو معلوم ہوتا نیکی ٹکڑی میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ رنگارنگ کانیج، وہ در سے کی سرخ و سپید عمارت، وہ دکھل سینما ہال، وہ دلاویز سینا گاہ اور مکانوں سے کہیں زیادہ حسین ان کے کینن جنہیں سات دن کی مسلسل دشت بیانی کے بعد دیکھنے کو اگر ٹکٹ بھی لگتا تو ہم فوجی رعایت نہ مانگتے۔ اور اب کہ یہ لوگ برضا و رغبت ہمارے کارواں کے دونوں جانب صف بستہ کھڑے

پھاڑی و حطان پڑی کلب کی طرح آراستہ ہو گئی۔  
کہا جاتا ہے کہ

منم بکوه و دشت و بیابان غریب نیست  
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ سلامت

لیکن حقیقت میں شرط منم ہونا نہیں، بلکہ ایک خاص ذاتی کیفیت کی ضرورت ہے اور زندگی سے ہر رنگ لطف اندوز ہونے کا ذوق ہے ورنہ فوجی بے چارے کہاں کے منم ہیں؟ رات آرام سے گزاری اور صبح سویرے پھر سڑک پر تھے۔ سڑک سے آپ بیکار ہو کر کسی قسم کی کوئی چیز تصور نہ کر لیں جسے پی ڈیجی ڈی نے اپنے صدری ٹیچوں سے سجایا بتایا ہو، بلکہ ہمارے سامنے عراق کا وسیع صحرا تھا جس کی مغربی حد فلسطین سے جالقی تھی اور شاہراہ سینہ صحرا پر لاریوں کی متواتر آمد و رفت سے خود پہلے سڑک بن گئی تھی جو "ہارمیک" نہ سہی، چٹلی اور ہمواری میں مال سے بھر کھاتی تھی اور کشادگی میں تو حرف شکنائے مال کا اس سے کچھ مقابلہ ہی نہ تھا۔ سڑک کی وسعت صحرائی وسعت کے برابر تھی۔ اسی وجہ تھی کہ اس پر ایک مقررہ سمت میں سڑک کرنے کے لئے دن کی روشنی و رات کی روشنی۔ رات کے مسافر اس کی کشادگی میں کھو کر رہ جاتے تھے، اسی لئے ہمارا قافلہ سرشام ہی کسی سوزوں مقام پر رک کر ڈیرے ڈال دیتا تھا۔

ہمارے اگلے پڑاؤ کچھ ابجد، ہوز کی قسم کے تھے ان کے کاندھ فی مقام تھے ایل جی ۵ ایچ ۳ ایچ ۳ وغیرہ اور ان کے مقابلے میں زمین پر یا ہوائی اڈہ تھا یا پہنک شیش، پچھلے قافلے کی جگہ تھے ویسے ہی مصنوعی مقام تھے، لیکن اگر ہمارے راستے میں یہ مقامات نہ ہوتے تو پھر اس دشت میں فقط خدا کی ذات ہی تھی۔ کہیں کہیں اس ٹکراؤ و رانے میں خانہ بدوشوں کے خیمے بھی نظر آتے تھے جن کے ارد گرد چند انسان کچھ گدھے اور ایک کثیر تعداد بھیڑوں کی پھر رہی ہوتی تھی، جنہیں دیکھ کر اس کی رزاقی پر ایمان آ جاتا تھا۔ یہ بدو تو خیر بھیڑیں کھالیتے ہوں گے، لیکن وہ بھیڑیں کیا کھاتی تھیں؟ یہ راز بھیڑوں اور ان کے رازق کے درمیان ہی تھا۔ ہر حال یہاں سمندر سے نہیں، بلکہ صحرا سے پیاسے کو خنم ملتی تھی جو یقیناً رزاقی تھی۔

تھے ہم خوبی قسمت پر ناز کرتے آگے بڑھتے گئے۔

ہمارا اس شام کا پڑاؤ مینہ تھا۔ مینہ سے کوئی ایک میل اور ہمارا کارواں رکا اور ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ زن ہوا۔ بریگڈ کمانڈر صاحب نے شاید ہمارے دلوں کو نفل لیا۔ سر شام ہی اعلان کر دیا کہ مینہ دیکھنے کی عام جھٹی ہے۔

۱۹۴۷ء میں اسرائیل ابھی وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن یہودی فلسطین پر چھا رہے تھے اور مینہ تو ایک بچے ہوئے بھل کی طرح ان کی گود میں گرنے کو تھا۔ اکثر یہودی یورپ سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ خیمہ "مینہ کا مزاج نہ صرف عمارات بلکہ عام طرز زندگی میں بھی فرکیا تھا۔ عرب تھے، لیکن کم اور وہ بھی مزدور قسم کے، مینہ کے مروج کو متاثر کرنا تو درکنار مینہ کے مزاج دان ہی نہ تھے۔ بچارے اپنے گھر میں اپنی تھے۔

پہلی رات شرم میں گئے تو ایک مشہور تفریح گاہ "پراسز" میں جا داخل ہوئے۔ یہاں کے ماحول میں وہ بغداد کے کبڑوں کی گرج چمک اور ڈالہ باری نہ تھی۔ اس جگہ کی کشش کے عناصر حسن اور سکون تھے۔ مرد باوقار اور خوش لباس تھے، لیکن تمام یہودی۔ کوئی دھکی یعنی عرب وہاں موجود نہ تھا۔ بارہ گئے تو مقبول ترین مشروب پائے گا اس نکلا، لیکن یہ ہمارے ہم وطن ماننے نہ تھے۔ پاکستانی ماننے مینہ کے مانوں کے سامنے براور خود اور وہ بھی سوتیلے نظر آتے ہیں۔ فلسطینی ماننے نہ صرف قسمت میں ہر گ تھے بلکہ لذت میں بھی دو آتشہ تھے۔ یہ ہوائے فلسطین کا فیض تھا یا یہودی محنت کا ثمرہ "اس پائے کی حقیقت تو نہ ہو سکی"

البتہ ہم نے دونوں ہاتھوں سے ایک مانا اٹھا کر مشین میں رکھا تو بار مینہ نے ایک نکل مٹا کر دیا۔ بھر کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور جب پی چکے تو وہ آسودگی میسر ہوئی کہ اس کی یاد مع ذائقہ آج تک باقی ہے اور اب گوجرانوالہ کے مانے اپنا خون جگر بیکار بھی وہ بات پیدا نہیں کر سکتے۔ اس رات ہم نے دیکھا کہ کئی مستند انگریز سے خوار اس نئے مشروب کی خاطر دھکی سے دستبردار ہو گئے۔

دوسرا دن بھی مینہ کی سیر میں گزرا۔ مینہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر واقع ہے، لہذا وہ اپنے سبز زبا کا کوئی گوشہ بھی چھپا نہیں سکتا اور نہ چھپانا چاہتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس کا

حسن بند نقاب کھولے قوس قزح کی طرح سامنے کھڑا ہے۔ ڈھلان خدا نے بنائی ہے۔ مکان انسان نے اور دونوں نے مل کر ایک دلکش شاہکار پیدا کر دیا ہے۔ ایک فیلسوف ساحلی سے بات کی تو بولا:

"مینہ پر ہی کیا منحصر ہے ہر شاہکار فطرت سے تعاون کرنے پر ہی وجود میں آتا ہے" مسئلہ مشکل تھا، لیکن مشکل کی حد سے کچھ سمجھ میں آ گیا۔

اگلے روز علی الصبح ہمارا کارواں پھر روانہ ہوا۔ مینہ سے نکلے تو ساحل کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کے درمیان چلی گئی۔ پہلے تیس چالیس میل یہودیوں کے ہاتھوں کے تھے جن کے شلاب ماننے آب و رنگ میں ایک یہودی دو شیرازوں کو شربا تے تھے جو ہاتھ ہلا ہلا کر بے شربائے ہمیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ پاس ہی یہودی کاشت کار مشینوں سے صحرا کو گھزارا بنا رہے تھے اور ہم فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ پھول ہیں صحرا میں یا پرانی قطار اندر قطار۔

پھر نہ ہاتھوں کا سلسلہ ختم ہوا اور کیا دیکھتے ہیں کہ مختلف قطعات زمین میں اونٹوں اور گدھوں کے ہاتھوں سے شربا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہ عرب کاشت کار ہیں۔ کھیتوں کے قریب گزرے تو عرب بچے بھاگے بھاگے آئے اور ہماری طرف ہاتھ بیچا کر "سگوارہ رفیق" کی صدا لگاتے گئے۔ صدا کا ترجمہ کرایا تو معلوم ہوا اسگریٹ کی بیک مائک رہے ہیں۔ ہم مسافروں کو پہلے دوست کو دیکھ کے گھریا دیا اور پھر سوچا کہ ہمارے عرب بھائیوں کا کیا ہے گاہے اور بتایا کہ چند ہی سال بعد فلسطین ہجرا نئے سے نکل کر تاریخ میں چلا گیا اور فلسطین کی جگہ اسرائیل نے لے لی اور ہمارے عرب بھائی ہٹا کر گزروں کے نیپوں میں منتقل ہو گئے اور بظاہر وہیں رہیں گے کیونکہ انرا (Unrra) کے مفت راشنوں کے علاوہ امریکہ کے خیراتی سکرٹوں نے ان کے دل سے یاد وطن کی غلغلی خاصی مٹا کر دی ہے۔ بلکہ سنا ہے کہ ان کا قاف حلق کی بجائے اب ناک سے نکلتا ہے۔

مینہ کے بعد اگلا پڑاؤ اسلوج تھا۔ اسلوج صحرائے سینائی کے مشرقی حاشیے پر واقع ہے۔ اسلوج میں رات گزار کر صبح دشت سینائی کی پہنائی سے گزرے تو دیرانی سے خوف سا آنے لگا۔ انگریزوں نے اس ریک زار میں یہ سڑک نہ بنائی ہوتی تو اسمعیلہ پہنچنے پہنچنے ایک ہر گزر



دامن کو ذرا بھولوں  
ان پھولوں کی خوشبو سے  
جو سامنے کھلتے ہیں !

اور شاید ٹاؤنٹسٹ طور پر دم لینا شروع بھی کر دیا تھا کہ کچھلی گاڑی نے زور سے ہارن دے کر ہمارا رومین پریشان کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد دریائے نیل عبور کیا جو شہر کے وسط سے بہتا ہے اور اہرام کی طرف بہتا ہے۔ یہاں ایک باندی پر کھلے صحرائیں داخل ہوئے اور غصہ خدا کا یہاں۔۔۔ یعنی قاہرہ کی بجائے۔۔۔ کاٹوائے نے دم لیا۔ گاڑی سے نکل کر بیچے قاہرہ پر نگاہ ڈالی کہ شاید انسانوں کی ہستی پر یہ اثر کیا ہو اور جب دیکھا تو ہمیں قاہرہ کا شاداب نخلستان دکھائی دیا۔ جو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اس کا تصور کر لیا اور یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کو ہندو رنج پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ لیکن خوفِ بزرگ کے ساتھ ایک کونے سے یہ خیال بھی آنسو دار ہو کر شایہ بن گیا اور کسی دن واپس آکر اسی قاہرہ کی زندگی میں حصہ لے سکیں۔ ہر حال میں اس وقت ہمارے دل کے اندر نیم دریا کے معرکے میں رچاکی حالت خاصی پکلی تھی۔

ہم کوئی چھ گھنٹے رواں رہے۔ دھوپ سے ہم اپنے وطن میں بھی مانوس تھے، لیکن صحرائی دھوپ یوں لگتی تھی جیسے بلا غرض قلب ہو رہا ہو چنانچہ دل کو تھا سے ہٹا کر سکندر یہ کے قریب امریہ پہنچے اور وقت کے لئے ڈیرے ڈالے۔ جوں جوں رات قریب آتی گئی مگر عائب ہوئے گئی۔ نصف شب کو ننکی کا یہ عالم تھا کہ ٹھنڈا عارضہ قلب ہونے لگا اور سپاہی دلیپ سنگھ نے توجہ جعینے پر دھڑکے ہاتھ کیا یا مر گیا اور مرنے لگا۔ خوالدار میت سنگھ نے دن رات کے درجہ حرارت کو دھنظر رکھتے ہوئے نہایت وثوق سے کہا کہ یہ بیماری دل کی نہیں اور نہ ہی علاج کی ضرورت ہے۔ دلیپ سنگھ محض گرم سرد ہو گیا ہے۔ صبح کا انتظار کیا جائے کہ سرد گرم ہو کر شفا پالے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، طلوع آفتاب کے ساتھ دلیپ سنگھ نے آنکھ کھولی۔ سینے پر سے ہاتھ اٹھایا اور مسکرا دیا۔

اگلی صبح ہمارا کارواں ساحلی سڑک کے راستے سلوم کو روانہ ہوا۔ جوں جوں سورج بلند

جاتی اور شاید یہ تاخیر ہمارے لئے ایسی ناموافق بھی نہ ہوتی کہ رول سے فوری ملاقات بھی بہت صحت افزا تقریب نہ تھی۔ خیر ہمارے جذبات کچھ ہی ہوں سڑک ہر حال پکی تھی۔

شام کو نرسوز عبور کر کے اسمعیلیہ میں داخل ہوئے۔ رات کا بیشتر حصہ اسمعیلیہ کلب میں گزارا، کیونکہ تہذیب سے قریب ترین آخری شب تھی۔ اس کے بعد صحرائے لیبیا کی راتیں تھیں اور جنگ کی بد تہذیبی۔

اسمعیلیہ کلب کے ماحول سے ہر طرف پونہ (یا شاید پھونہ کتا زیادہ صحیح ہے) نپکتا تھا۔ لمبی موچھوں والے اویجز عمر کے کرنیل اور جرنیل جا بجا بکھرے پڑے تھے جن کی خدمت سے محاذ جنگ تو محفوظ تھا، لیکن کلب کا محاذ ان کی ہمہ وقتی زد میں تھا۔ ان کی کلبت و ابھنگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے فرنیچر کا حصہ معلوم ہوتے تھے، البتہ کھانا پینا اور کافرائیچر سوائے لانے کے ہر کام کے لئے تیار تھے۔ کلب کے سبز قطعات پر برقی پنکھوں کے نیچے بیٹھ کر زیر دینا ان کا دوسرا اہم کام تھا۔ خدمت کے لئے گمری لائی ٹوبیوں والے اور گاڑھے کالے چروں والے سوڈانی خدمت گار تھے جو پونہ کلب کے پورے ماحول میں گھومتے تھے۔ صرف "کوئی ہائے" کی مانوس آواز نہیں آ رہی تھی۔

صبح محاذ جنگ کی طرف بڑھتا تھا، لہذا رات کو ہمارے انگریز ساتھیوں نے معمول سے بہت زیادہ پی اور زیادہ دیر پی کہ جنگ پر جانے کی یہی ان کی نصیحت ہے۔ اس خاکسار کے پاس کتنا رسوز تو تھا، لیکن کوئی سفینہ نہ تھا کہ اسے جہاز کر مسلمانوں کی خدمت پوری کرنا۔ ہاتھ اٹھائے اور دعائے خیر مانگی۔

کوئی دوپہر کا وقت تھا کہ ہم قاہرہ پہنچے، بلکہ قاہرہ سے گزرے کہ وہاں گھبراہٹ کی اجازت نہ تھی۔ پاک و ہند کے مسلمانوں کے دماغ میں قاہرہ کا تصور سراسر جامد ازہر کا تصور ہے یعنی اہل قاہرہ یا رکوع میں ہیں یا ہودھیں ہاتھ میں کوزہ ہے یا شیع اور سر پر سرخ روی ٹوپی۔ لیکن قاہرہ کے بازاروں سے گزرتے ہوئے اس شہر کی جھلک دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہاں ازہر کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور اسے دیکھ کر جی ہلکا ہوا۔

اک لمحہ یہاں دم لوں

ہو تا گیا ہمارا اور جب حرارت بھی بلند ہونے لگی۔ بارہ بجے کے قریب سورج کے ساتھ ہم بھی نصف النہار پر تھے۔ ہر حال اب شکایت کا مقام نہ تھا کہ کارزار کے مضامین میں تھے۔ وہ مقامات جو ان دنوں تاریخ کی زبان پر تھے 'ہمارے رستے میں یکے بعد دیگرے آئے گئے۔ شفا العالین 'مری' مطروح 'سیدی باری باری وغیرہ۔ العالین نے ابھی وہ شہرت حاصل نہیں کی تھی جو پردہ تقدیر میں اس مقام اور لارڈ مکنری کی ناک میں بیٹھی تھی۔

مری' مطروح پہنچے تو سال گزشتہ کی ایک طرفہ جنگ کی کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اسی مقام پر لارڈ ویل اور ان کے چوتھے انڈین ڈویژن نے موسیقی کی فوجوں کو مرنا بنایا تھا۔ جنگ کے عرفی اس لئے تھی کہ اس میں لڑنے کا پارٹ صرف ہمارے ڈویژن نے ادا کیا تھا۔ یہ مخالف یعنی اطالوی سپاہی سنبھ پر آئے تھے 'لیکن پھر قی سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے' بلکہ کچھ دور جا کر ایک تختہ ختم گئے تھے کہ تعاقب کنندگان کا ناقص دم نہ ہو سکے۔ اسی محرکے کے متعلق کسی نامہ نگار نے ہمارے سپاہی کی رائے پوچھی 'تو اس نے جواب دیا: "میں ایک سرساز تھی!" یعنی یہ اسے نقلی مشق سمجھ رہا تھا جو امن کے زمانے میں کی جاتی ہے۔

اسی جنگ میں جب اطالوی افسروں کو مورچوں سے نکالا گیا 'تو ان کے ساتھ ان کی واشتائیں بھی برآمد ہوئیں۔ اس پر ہمارے ایک ہنگری سپاہی کی فیرت جوش میں آگئی اور اس نے ایک اطالوی کرنل کے ذاتی اسلحہ کا بوجھ ہٹا کر تے ہوئے اسے طعنہ دیا کہ اور نہیں تو ان "تیموں" کی خاطر جان پر کھیل جاتے اور پھر اسے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ "موسمی تے پانی پا کے ڈب مر!"

اور یہ سطور لکھتے ہوئے وہ مرصع ہسپتال بھی یاد آتا ہے جو اسی مری' مطروح میں کینٹن میاں خاں نے ایک اطالوی بنالین بکناڈر کے گلے سے اتار کر تختہ ہمارے گلے میں ڈال دیا تھا اور بعد میں اسی ہسپتال کی بدولت ہم ایک ناکرہ قتل میں ماخوذ ہوتے ہوتے بچ گئے۔ لیکن یہ قصہ اپنی جگہ پر!

اس لیے اگرچہ مری' مطروح میں خاموشی تھی 'تاہم بطور مطروح سے ایک ڈوٹی سی خبر تھی کہ جنگ بہت دور نہیں۔ سڑک کے کنارے ہر چند قدم پر کسی پونٹ کے پام کا بورڈ تھا یا

تیر کا نشان 'جو صحرائی وسعت میں کسی چھپے سیٹائی ڈپو یا ورکشاپ کی طرف اشارہ کرتا تھا' مگر سب سے بڑا بورڈ جو نظر آیا کسی پونٹ کے پارے میں نہ تھا بلکہ کھیتوں کے متعلق تھا۔ اس بورڈ پر قد آدم حروف میں لکھا تھا۔ Kill That Fly جو سراسر شجاعت کے منافی تھا 'چنانچہ اسے پڑھ کر ہمارے غازی دلوں کو نہ امت سی محسوس ہوئی کہ آخر کبھی مارنا کوئی موافقی ہے' لیکن بعد میں جب ان صحرائی کھیتوں سے ہمارے قریبی تعلقات قائم ہوئے تو معلوم ہوا کہ جنگ میں گس کشی ایک خاصا قابل فخر کارنامہ ہے۔ اس جنگ میں ہمارے سامنے تین دشمن تھے۔ پہلے 'اطالوی' اور کھیاں۔ جرمنوں کا معاملہ تو ذرا مختلف تھا لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ ایک اطالوی کھیاں کے سامنے ایک کھیاں مارنا زیادہ نفع بخش ہے۔ کیونکہ حربی صلاحیت کے اعتبار سے ان ریگستانی کھیتوں کا مقام اطالویوں سے کسی قدر بلند تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ بورڈ لگا دیا گیا تھا 'ورنہ ہمیں ان غیر ملکی کھیتوں سے کوئی ذاتی عنوان نہ تھا۔ یہ محض Self Defence کا نشانہ تھا۔ اگر ہم سے کھیاں جیت جاتیں 'تو ہمارا وقت میدان جنگ کی بجائے ہسپتال میں گزرتا! یا شہانہ ہسپتال سے بھی ذرا آگے۔

مطروح سے نکلے 'تو سیدی باری سے ہوتے ہوئے شام کو سلوم پہنچے' یہ مقام مصر اور لیبیا کی سرحد کے علاوہ امن اور جنگ کی سرحد پر بھی واقع تھا۔ رات وہیں جنگ کی طرف پہنچ کر کے بچہ روم کے کھڑکے گزار دی اور صبح دورہ ہلٹا یہ سے گزر کر طبق سے چند میل اوپر بل حمہ کے مقام پر فروکش ہوئے۔ یہ ہمارے کارواں کی آخری منزل تھی 'لیکن کوئی بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہماری منزل مقصود بھی تھی۔ کیونکہ اب ہم ریزرو بریگیڈ ہونے کی حیثیت سے میدان جنگ کے دروازے پر بیٹھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ درون خانہ کیا ہو رہا ہے۔

صرف چند میل جنوب میں جرمن فوجیں ہمارے بریگیڈوں سے برسر پیکار تھیں۔ توپوں کی گھن گرج سے فضا میں ایک ہیبت ناک اور مستقل سی گونج تھی جس میں شہنشاہ گن گراہی یعنی ہمارے لئے کچھ قواضع کا رنگ نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر گولہ ہمارے سر پر ہی بار امت ہٹا کرے گا 'چنانچہ پہلی رات گولہ شکاری میں ہی گئی۔ دوسری رات کسی قدر مانوس

ہونے لگے، لیکن مانوس ہونے کے بعد بھی ہمارا استعمال تو یہی تھا کہ جو نئی ضرورت پڑے ہمیں مشکل میں جھونک دیا جائے۔ سو ہماری دماغی کیفیت وہی تھی جو بقرعید سے پہلے ہر دور اندیش بکرے کی ہوتی ہے اور بمشکل دو پہننے گزرتے تھے کہ ہمارے بریگیڈ کی بقرعید آگئی۔ یہ تقریب ہم نے جرمنوں کے ساتھ کس دھوم سے منائی۔ اس کا ذکر ذرا آگے آئے گا۔

## جنگ سے پہلے

طریق پر برطانوی قبضہ ضرور تھا، لیکن قباخانہ بدوشوں کا سا۔ کیونکہ پہلے جنوب مغرب سے جرمن فوجیں ہمارے العلم اور نائٹ برج کے مورچوں پر بے حد غیر دوستانہ دھاؤ ڈال رہی تھیں اور قباخانہ قبضہ بھی شدت سے ڈگ رہا تھا۔ امکان تھا کہ جرمن کسی لمحے ان دو مقامات کو روند کر طریق پر بھجوت پڑیں گے لہذا طریق میں جہاں ڈٹ کر لڑنے کا سامان کیا گیا تھا وہاں رشت سفر بھی باندھ رکھا تھا کہ پانچار بھاگنا پڑے تو کھلے بستر قرار میں جا سکیں نہ ہوں۔ ہمارا بریگیڈ اب اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ طریق جانے کا حکم ملتا ہے یا عدم کا۔ ان دو مقامات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا مشکل تھا۔ ہم جدھر جاتے 'راہی ملک عدم ہی تھے۔

بل محمد میں بیٹھے ہوئے جنگ نہ صرف سنائی دیتی تھی بلکہ رات کو دکھائی بھی دیتی تھی، لیکن دو دن دیکھنے سننے کے بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے جنگ نہیں، یونہی پڑوس میں قماشنا ہو رہا ہے۔ جی چاہتا کہ یہ قماشنا ذرا اور قریب سے دیکھیں، چنانچہ حجامت کے بے لطف طریق جاننے لگے۔ گویا جرمنوں سے چند قدم ہی اُدھر۔۔۔ ٹائی کی کرسی پر بیٹھے 'تو محسوس ہوا کہ آرائش کیسو کے لئے اس سے بستر ماحول قاہرہ میں بھی نہ ملے گا۔ ٹائی کی دکان کے اندر قینچیاں اور استرے پل رہے تھے اور باہر توہیں اور بندوقیں دندنا رہی تھیں۔ اگر یکلفت توہیں اور بندوقیں ختم جاتیں تو قینچی کی لے لوٹ جاتی اور استرے کی تل بگڑ جاتی، لیکن نرمنوں کے

1- صحرائے عرب میں لڑنے والی برسی افواج کا سرور منزل

2- کوئی بے وقوف بھی بے تراسی سے ہر کر سکتا ہے۔

3- یہ آج سے چند ہی برس پہلے کے تاثرات ہیں۔ قطعی ندرائیں کے سوجھ بوجھ ہیں ماری اور وطن پرستی کو مستحکم سلام کرنا ہے۔

4- مورچوں

5- بعد میں غصت کر لی یہاں تک اہم ہی

6- "مرا اس بھی کو"

7- دانی حجامت

نے ایک منٹ کے اندر اندر صدق دل سے مہمان بوند کے ہاتھ پر دست نہ کر لی تو ہماری خیر نہیں۔ ساحل کی طرف دیکھا تو بے اختیار منہ سے نکلا:

کشتی نکستہ نیم اسے یاد شرط بر خیز!

معا خیال آیا کہ ہماری جنگ اور حیات تو تمام ہو گئی، لیکن پسماندگان کی انہوں میں نہ مردوں میں ہوں گے نہ زندوں میں اس Missing Believed Killed ہی کہے جائیں گے۔ بچنے کا معروف ذریعہ تو ایک ہی تھا کہ یاد شرط چل پڑتی اور ہمیں اڑا کر ساحل تک لے جاتی، لیکن اب کون اسے شیراز سے لے کر آتا؟ اللہ کا نام لیا اور اپنی محدود پرکاشہ استعداد کے سارے ساحل کی طرف توجہ شروع کیا۔ اس سم میں خدا جیسے ایک ہلو لگاؤ ایک سال، تیرتے تیرتے آخر کار ہم ساحل پر پہنچے، لیکن یہ درود کچھ نیسے دروں نیسے ہوں کا سا تھا۔ یعنی ہمارا دروازہ تو ہی تھا، صرف سرائے بازو ساحل کی سمت تک پہنچ سکے اور وہیں محمد

جسب کچھ کھلی تو معلوم ہوا کہ کشتی نے میں سمندر میں ٹھانے آئے تھے۔ شام ہونے کو تھی کہ اٹھے اور لاو چکے لڑکتے کس پہنچے۔ جب خبر عام ہوئی کہ ہم زندہ ہیں تو لوگ ہمیں قرب و جوار سے دیکھنے آئے۔ چند بدتمیزوں نے ہم سے بھیرہ دوم کی دلچسپیوں کے متعلق سوال بھی کئے۔ گویا ہم نے اس لئے بیان کی بازی لگائی تھی کہ ان مسخوں کے ہاتھوں اپنی

معا ہوئی تو وہ حکم بھی آگیا جس کا انتظار تھا۔ یعنی یہ کہ برگینڈ آگے بڑھ کر سیدی رنڈی کی پہاڑی پر دوقی مورچے قائم کرے اور جرمنوں کے چلنے کا مشعر رہے کیونکہ آٹار سے پیدا تھا کہ جرمن طریق کی بجائے سیدی رنڈی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دس دن کے آرام کے بعد ہمارا برگینڈ بل سم سے اٹھ کر سیدی رنڈی میں مورچہ گیر ہوا۔ ہماری پیادہ فوج کے دستے پہاڑی کی جنوبی ڈھلان پر۔۔۔ یعنی دشمن کے آگے سامنے۔۔۔ کیل کائنات بلکہ ذرا زیادہ مملکت ہتھیاروں سے لیس ہو کر چنڈ گئے۔ اور ہم بیڈ کو اڑدالے پہاڑی کی شمالی ڈھلان پر زمین دروز مورچوں میں داخل ہو گئے جہاں ہاتھ بھر سکین آفس کھول

ہوتے ہوئے ایسے حادثے کا امکان نہ تھا چنانچہ ہماری جہالت پر سے جگہ اعزاز کے ساتھ ہوتی رہی۔

لیکن اس اعزاز کے باوجود ہم جہالت کے دوران کا بچتے ہی رہے۔ وہ اس لئے کہ طریق کے چاروں طرف غار دار تار کی حفاظتی باز لگی ہوئی تھی اور بل سم سے آتے ہوئے ہاڑ کے اندر داخل ہونے پر یوں محسوس ہوا تھا کہ محفوظ ہونے کی بجائے محسوس ہو گئے ہیں چنانچہ ہم دل ہی دل میں دعا مانگتے رہے کہ "اللہ! اٹھائے جہالت میں جرمنوں کو حملے کی قوت نہ ملے۔ لڑائی میں ہارنا اور ہتھیار ڈالنا برحق ہے، لیکن کھلے میدان میں طریق کی چاروں طرف سے تو ہتھیاروں کے علاوہ اپنے آپ کو بھی ڈالنا پڑے گا۔" ہماری دعا قبول ہوئی اور جہالت ختم ہوتے ہی ہم ہاڑ سے نکلے۔ جیہوں میں بیٹھے اور بل سم کی کھلی گھاس جا کر دم لیا۔

خیال تھا کہ اب کسی لئے لڑائی کا حکم ملتا ہے لیکن کئی روز گزر گئے اور وہ لمحہ نہ آیا۔ ہم نے سوچا فراغت ہے حمل کیوں نہ کر لیں۔ پہلے چل کو بہت عرصہ تو نہیں ہوا تھا۔ یہی ہیں جنہیں روز اور ہری بات تھی اور ہر چند کہ جنگ بھی تو یہی تھی تاہم بچہ دوم کی قرب و جوار اس کی مشکلتی، جملہ لاتی موجوں کی صدا مسلسل دامن دل سمیٹتی رہی تھی چنانچہ سہ پہر کا وقت تھا کہ یکایک مثل آزاد!

یہی جی میں آئی کہ گھر سے

شلتا شلتا ذرا روم چل !

اور ذرا برنگس آزاد!

وہاں جا کے کپڑے بدن سے اتار

سمندر کی موجوں پہ تھامیں سوار

اما بعد بھیرہ دوم کے شفاف زمروں پانی کے گوارا اور گداز لہس نے وہ آسودگی بخشی کہ پے در پے غوطے لگائے شروع کر دیے اور اپنی ہم غوطہ چھیلیوں کی طرح زیر آب قمر کئے گئے۔ یہ فضل ایک محنت کے عالم میں کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ آخر سب تب پر آئے اور آٹھ کھلی تو معلوم ہوا کہ سودو سو گز درون سمندر آپکے ہیں۔ یعنی اگر بھیرہ دوم کی شار کون



رہا قتل تو وہ ماضی قریب کے تجربے کے بعد محض ایک داہمہ تھا۔ ایک سپنا اور سپنا بھی کبھی نہ آنے والا کہ بغیر خیریت کے سپنے نہیں آیا کرتے اور سیدی رزلیخ میں خیریت کہاں؟ جہاں بیٹھ گئے یا لٹ گئے، بے بستہ ہالیں رات گزار دی 'سوائے اس کے کہ کوئی گولہ قتل ہو۔

تیسرا دن تھا اور جرمن حملے کا نام نہ تھا۔ ہمارے لئے حملے کا انتظار خود حملے سے زیادہ صبر آتا تھا۔ صبح صبح ہی ایک چٹان سے لگ کر ٹیکہ دیتا تھا 'بے آب و دانہ' زندگی سے تیزار بیٹھا تھا کہ ایک خدا کا بندہ قریب آتا دکھائی دیا۔ پاس اگر رکا اور سیلوٹ کر کے کہنے لگا:

"صاحب! ہمارے صاحب نے آپ کو بلایا۔"

تنگ تو بیٹھا ہی تھا جواب دیا:

"جاؤ، تم اپنے صاحب کی بشت میں جا سکتے ہو، کچھ؟"

غالباً کچھ نہ سمجھا اور چلا گیا، لیکن ایک گھنٹے کے بعد پھر آ نکلا اور بولا:

"صاحب کا اصرار ہے کہ سنو، آؤ۔"

اب کے اصرار کا تعلق صاحب کا نام پوچھا تو بولا:

"دیکھیں منظر۔"

دل میں کہا۔ "کوئی ہو گا۔" لیکن کبھی سنا تھا نہ دیکھا۔ پتا میرے پوچھنا:

"تمہارے صاحب ہمیں جانتے ہیں؟"

جواب میں کہنے لگا:

"کیٹین صاحب نے صرف اتنا کہا ہے کہ سیدی رزلیخ میں نیا بریگڈ آیا ہے۔ اگر اس میں کوئی دسی افسر ہو تو اسے کو 'خدا کے لئے مجھے آکر لے' میں چھ ماہ سے ایک پائیر پونٹ لئے اکیلا صحرا میں بیٹھا ہوں اور کسی ہم جنس سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔"

یہ دل گداز کہانی سنی تو پتا میر کے ساتھ ہو لیا اور سیدی رزلیخ سے کوئی دو میل پیچھے مشرق کو ایک پائیر کیمینی کی لائنوں میں جا داخل ہوا۔ آگے ایک بھابی پکتن کا کھکھلا ہوا چروہ اور کھلے مسمان نواز بازو تھے۔ معائنے سے فارغ ہوئے تو بولے:

اور اچھینچ لگا۔

ایک دن گزر گیا۔ ایک اور گزر گیا، لیکن جرمن حملے سے گریز کر رہے تھے۔ ہم مسلسل دو روز کے امن سے تنگ آکر غاروں سے نکلے اور سیدی رزلیخ کی وسیع سطح مرتفع پر مزاحمت کرنے لگے۔ اس پہاڑی پر پچھلے سال کئی معرکے ہو چکے تھے جن کے نشان بیسیوں بیکار توپوں، سینکڑوں ہتھیاروں، گولوں اور ہزاروں کارگر، مگر پوشیدہ بارودی سرخوں کی شکل میں بکھرے پڑے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک چلتی لاری کا پاؤں ٹوانستہ طور پر کسی سرنگ پر آگیا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنے سواروں سمیت خاک و خون میں بدل گئی۔ سیدی رزلیخ کی سطح پر قدم الگ الگ پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا کہ نیچے کوئی آفت نہ خراب ہو۔

سیدی رزلیخ کی زندگی عام روزمرہ کی آسائشوں سے محروم تھی جرمن توپیں کسی وقت ایک سوالیہ گولہ پھینک سکتی تھیں اور پھر نہایت مختصر مگر شراب ہو جاتا، لہذا ہمیں کھڑا کرنے کا تکلف کسی قدر بچا تھا۔ بس ہر روز ڈبل پانی کا ایک کنکرا، ملی دیمت کا ایک ٹین اور پھل کا ایک ڈبہ مل جاتا جو کسی چٹان کی اوٹ میں چھپا کر ان کے لئے رکھ دیتے تھے۔ ہاتھ دھونے کے لوازمات میسر نہ تھے۔ پانی فقط زبانی تر کرنے کے کام آتا تھا۔ باقاعدہ پانی پینے کا دستور نہ تھا اور ہاتھ منہ دھونا تو ایسی عیاشی تھی جسے یاد کرنے کی دل حزیں کو اجازت نہ تھی۔

چوبیس گھنٹوں کے لئے پانی کا راشن فقط ایک بوتل تھا اور صحرا میں پانی کی اجبی طور پر بچانے کے لئے بھی ایک واجب سی جمیل کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ ہم نے کبھی ایک سالم گھونٹ کو اپنے حلق سے نیچے اترتے نہ دیکھا۔ بس بوتل کو منہ سے لگاتے اور جو خسی زبان کو ایک گرم مرطوب سا احساس ہوتا اسے زبان سے علیحدہ کر دیتے۔ بخدا ہمارا پانی جتنا پیاس بچانے کے لئے نہ تھا، بلکہ اس لئے کہ ملی دیمت کے ست رو لقموں کا گھٹے میں کیو نہ لگ جائے۔ پھر ہر کھانے میں خواہ وہ ملی دیمت ہو یا سینڈویچ، ایک مناسب مقدار صحرائی رست کی بھی ضرورت شامل ہو جاتی۔

معت نہ پوچھ، فتنہ مرہم، جرات دل کا

کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم ہے

"تعارف بعد میں ہوتا رہے گا" پہلے غسل کرلو۔"

سیدی رنچ میں غسل کی دعوت! گویا پکتان صاحب ایک عام فہم صحرائی مذاق کر رہے تھے۔

عرض کیا:

"پہلے تعارف ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ غسل تو اب وطن میں جا کر ہی میسر ہو گا۔"

جواب میں مظفر خاموش رہے اور میری سبے بیتی کا احترام کرتے ہوئے میرا بازو تھامے چل پڑے اور آہستہ سے مجھے ایک غیبے کے اندر داخل کیا۔ اندر گیا دیکھا ہوا کچھ پانی سے لبریز ایک ٹب پڑا ہے جو صحرا کے پیاسے کو پہلی نگاہ پر تلاب نظر آیا۔ دھڑکی جانب صاف خشک توبہ اور صابن رکھا تھا۔ اوپر ہم تھے کہ کبھی اپنے پیچھے کو اور کبھی ان کے گھر کو دیکھتے تھے۔ پکتان صاحب نے ہمارے چہرے کی کینہ۔ دیکھی تو مسکرائے اور خیمہ بند کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہم نے کیا اسے غسل میں کتا جانتے۔ ہمارے تھکے و سوجھے جسم نے انگوڑوں کی طرح پانی جذب کر لیا۔

اس محشر تابیاب سے فارغ ہوئے تو پکتان صاحب کا اردلی ایک تازہ دھلا ہوا خاکی جوڑا لایا۔ بتایا گیا کہ ہمارے اپنے کپڑے دھونے کے لئے بھیج دیئے گئے ہیں۔۔۔ یہ یونٹ فارم نہ تھی خاکی رنگ میں عموماً جوڑا تھا پستانو عسوس ہوا کہ صحرا میں جنگ لڑنے میں آئے 'ڈرا' نظر نے کاک نیل پادری پر آنے کی زمت دی ہے۔

اتنے میں دوسرے غیبے سے مظفر کی آواز آئی:

"اگر نہ اپنے تو جلد آؤ کھانا کھانا ہو رہا ہے۔"

یہ دو سرائے اناقی حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ سیدی رنچ میں گرم کھانے کا وجود؟ ناممکن۔ صحرا میں تو صرف ایک ہی کھانا تھا: ملی جیت جو نہیں میں سرشام ہی چراغ مفسس کی طرح بجھا سا رہتا تھا۔ لیکن کھانے کے غیبے میں داخل ہوا تو کیا دیکھا ہوں! کیا دیکھا ہوں!! مرغ مسلم اور بھاپ کے بادل 'پلاؤ' اور بھاپ کی گھٹائیں اور کیا کیا کچھ۔ میرے دل نے لگا تار دو تین دھڑکنیں مں کیں۔ اگر رک بھی جاتا تو روا تھا۔ اس جگہ کا ثواب جو ابھی ہم نے کتنا دل

ہی دل میں کیشین مظفر کی تذر کیا اور مرغ کو وہاں پہنچایا جہاں اس کا غیر تھا۔

پھر پکتان صاحب سے باتوں کا دور شروع ہوا۔ یہ غصص شیریں خصال ہی نہ تھا شیریں دہن بھی تھا۔ اس کی باتیں سننے سننے دو گھنٹے گزر گئے۔ یوں جیسے دو لمبے گزرے ہوں۔ وناوازی کا یہ سلیقہ پہلے نہ دیکھا تھا۔ اگر جنگ سے اٹھ کر نہ آیا ہوتا تو مظفر کی باتیں ہی سننا رہتا لیکن خیال آیا کہ کہیں طویل غیر حاضری کی وجہ سے بھگڑاؤ اس نے قرار دیا جہاں رخصت چاہی اور برگینڈ ہیڈ کو اس پر پہنچا۔

شام ہونے والی تھی۔ معلوم ہوا ڈویشن کمانڈر جنرل ریس (Rees) تشریف لائے ہوئے ہیں اور قہر ہے۔ یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں جرمن مورچوں پر ایک محدود حملہ کیا جائے والا ہے۔ مقتصد اس سب سے غصص کا یہ تھا کہ دشمن کے مزاج اور ارادے کا اندازہ لگایا جائے اور اس غرض کے لئے دشمن کے پتہ چھوڑ دیں۔ دشمن کو مار بھگا دیا اس کے مورچوں پر قبضہ کرنا دمان تھا۔

اردلی کی باتیں سن کر میرے میں ہماری ایک پٹن آگے بڑھی۔ اس پٹن کے کاروبار اور خیر و عافیت کے متعلق کچھ شیریں جیبے کے لئے ایک سگنل کا دستہ ساتھ کر دیا گیا۔ اس دستے کے پاس دو گاڑیاں تھیں جن میں وائزلیس میٹ رکھے تھے۔ دستے کے کمانڈر کیشین کار تھے جو میرے پیچھے تھے۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ سگنل آفس میں پہنچ کر وائزلیس میٹ سے کان لگا کر ان کو خبریں اور جو بھی کوئی گرم خبر آئے جنرل ریس تک پہنچا دوں۔ جنرل موصوف کوئی بیس گز کے فاصلے پر اپنی وین (گاڑی) میں بدستہ انتظار تھے 'جب گمنان بھر گزر گیا اور شیون کی کوئی خبر نہ آئی تو جنرل صاحب متشکر ہونے لگے اور صورت حال معلوم کرنے کے لئے اپنے اردلی کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے اردلی کو اطمینان سے جواب دیا کہ No News اور خدا جائے کیا سوچیں کہ ساتھ ان الفاظ کا اضافہ بھی کر دیا:

"And No News is Good News"

اردلی کم بہت نے ہمارا پیغام مع ہماری فلاح سنی کے جنرل صاحب تک پہنچا دیا۔ ہماری فلاح سنی بھی ایسی کیا تھی فوجی حلقوں میں یہ فقرہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ صرف یہ کہ ایک سیکٹر

فوج میں ایسی گوشمالی کو رازداری کہتے ہیں اور ہم نے خوب سیر ہو کر نوش کی۔

اب جنرل صاحب ہمیں سینما میں فلم دیکھنے نہیں بھیج رہے تھے بلکہ دشمن کے مورچوں میں اپنی گم گشتہ ٹالین کی خبر لینے کے لئے۔ اور یہ کوئی معمولی پرائیویٹ سا کام نہ تھا بلکہ اچھی خاصی ملک سی بین الاقوامی مسم حسی۔ حکم سننے ہی ہمیں وہ ہاتھ یاد آئے جو ہمارے بازو پر امام خاصان بازو کا کرتے تھے، لیکن جو ہاتھ ہمارے قریب ترین تھے، ٹائیک ہر نام سنگھ کے تھے۔ سو وہ قسلی بھی میسر نہ ہو سکی، چنانچہ قمر نشین برجہاں نشین، ایک گاڑی ملی۔ اس میں وائزلیس میٹ پیسٹری سے نصب تھا۔ دو تین آدمی بھی ساتھ لئے اور گاڑی نصیب دشمنوں، سوئے دشمنوں روانہ ہوئی۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی اور بازو کے دونوں طرف بارودی سرنگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کوئی انسان یا گاڑی سڑک سے ذرا ہٹکی اور تار میں الجھی۔ سرنگ پر پاؤں آیا اور ایک ایسی سرنگ پھٹی، پھر ایک تن میں تار اور تار میں پھنسنے والوں کا قصہ پاک ہو گیا۔ ہمارا قصہ پاک ہونے کے امکانات اور زیادہ روشن تھے کہ ہم اندھیرنی رات میں بقیان جلائے بغیر سفر کر رہے تھے اور سڑک کے کنارے ہمیں نظر نہیں آتے تھے۔ یوں سمجھیں کہ ریل کی سرنگ میں سے کھائی جہاز اڑا کر لے جا رہے تھے، ذرا دائیں یا بائیں چھو گیا اور قصہ پاک!

چلتے چلتے کئی کئی میل گئے ہوں گے کہ سامنے ایک ساکن گاڑی کی پشت دکھائی دی۔ "یا خدا! یہ دشمن تو نہیں؟" ذرا ہمیں چھوٹا، لیکن پشتراس کے کہ دیرا ہوتا شروع ہوتا، ہمارا ڈرائیور ہنسنا اور بولنا:

"جی اے تیں بھگت سنگھ دی گڈی اے۔"

بلکہ غور سے دیکھا تو گاڑیاں حمیں اور وہی وائزلیس کی گاڑیاں جن کی بھیجی ہوئی خبروں کے لئے جنرل ریس گوش بر آواز یا فی الحال گوش بر ہوا تھے۔ گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے اس پسماندگی کی وجہ پوچھی تو بولے، "پکستان صاحب پچھڑ گئے ہیں صاحب آگے آگے جیپ میں جا رہے تھے، پھر یک لخت غائب ہو گئے۔"

لفٹنٹ ایک جنرل کو اس بے باکی سے نہیں کھلا بھیجتا۔ قہوڑی دیر کے بعد اردن پھر نمودار ہوا اور حسب توقع ہمیں بتایا کہ جنرل صاحب سلام کہتے ہیں۔ اٹھا، جنرل صاحب کی دین کے پاس گیا۔ دروازے پر دستک دی اور چہرے پر ایک مصنوعی سکون بلکہ کانپنا کانپنا تبسم اڑھ کر اندر پاؤں رکھا۔ اب جنرل صاحب کو جو دیکھتا ہوں، تو داغ کے معشوق کی طرح

بھوس ہنسی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں!

ہمارا سکون اور تبسم دونوں ایک لیلیف سے پیسے میں تحلیل ہو گئے۔

جنرل صاحب بولے:

"جب مجھے نو نووز کے معنی جاننے کی ضرورت ہوئی، تو میں خود پوچھوں گا، مگر پھر نہ مجھے میں کوئی تشبیحات سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

جواب میں یس سر کے علاوہ کیا کہہ سکتا تھا؟ فوج میں کچھ بڑا روں جوابوں کا ایک جواب ہوتا ہے۔ اس سے بہتری بلا نہیں مل جاتی ہیں، لیکن جنرل ریس ایک دوسری قسم کی بلا تھے۔

"تو پھر شخون کی کیا خبر ہے؟"

"سرا کچھ بھی تو نہیں۔ اس طرف سے کوئی بولہ ہی نہیں۔"

"تم کیا کر رہے ہو؟"

"سرا کان لگائے بیٹھا ہوں، جو نئی....."

"تسماری دو ٹانگیں بھی ہیں؟"

"نہیں سر۔"

"پھر دو ٹو اور خود جا کر خبر لے آؤ۔"

"نہیں سر۔"

یہ کہہ کر سیلوٹ کیا اور اسی ہاتھ سے واپسی پر ماتھے کا پینٹ پونچھا۔ دین سے نکل رہا تھا تو جنرل صاحب نے ایک رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "ساتھ ایک وائزلیس گاڑی لے جاؤ اور جہاں بھی کچھ نظر آئے، مجھ سے براہ راست بات کرو، خواہ نو نووزی کیوں نہ ہو۔"

اس واقعہ کے بعد جرمنوں نے ہمیں ذرا زیادہ توجہ کا مستحق سمجھا۔ بلکہ وہی دن بعد ہمیں اس قدر توجہ دی کہ ہمارے ریگڈ میں سے جو بچ رہے انہیں جرمنوں کی کم الفتائی کی کبھی شکایت نہ ہوگی۔

اس مقام سے آگے چار پانچ میل تک No Man's Land تھا اور ہماری بٹالین یہ فاصلہ عبور کر کے اس وقت دشمن سے دست و گریبان تھی۔ گولیوں اور گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن سمرای و سعت میں ان کی سست یا مقام کا اندازہ مشکل تھا۔ اب نو نیوز کی وجہ تو معلوم ہو گئی تھی لیکن حیران تھا کہ جنرل ریس کو کیا خبر سمجھوں۔ اگرچہ بولا تو ایک انگریزی ہاؤس کے مطابق جنرل ریس یہ نفس نہیں ایک پتہ جن دیتے ہو ایک جنرل کے لئے بھی خاصا جو کھوں کا کام ہے۔ دوسرا مقام نہ تھا کہ سینکڑوں جوانوں کی موت اور زندگی کا سوال تھا۔

اسی او میز میں تھا کہ سامنے سے ایک جیپ آ کر رکی۔ یہ کمپن کا کھنٹے۔ ہانپتے لاپتے بلکہ روتے دھوتے! ہوا یہ تھا کہ کمپن صاحب ہاتے وقت ہاتے سات میل پیچھے دیکھے بغیر لکھ گئے تھے۔ جب دشمن سے ٹکر ہوئی اور جنرل صاحب کو کامیابی کی خبر پہنچنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو وارنٹس گاڑی کو آواز دی "گو باک" میں میرے کو بلا رہے ہوں گاڑی کی تلاش میں لگے تو پانچ میل پیچھے آہڑ اور اب سامنے سے آئے۔ جنرل صاحب نے کہا "وہاں دے رہا تھا۔"

جب مجھ سے کہانی سنی تو مٹانے میں آگئے۔ کمپن نے مشورہ دیا کہ خبر سر حال کامیابی کی ہے خود ہی جنرل صاحب کو سنائیں۔ کمپن کار نے مائیک ہاتھ میں لیا اور جنرل صاحب سے ابتدائے کام کی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کپتان صاحب پر بتدریج ایک شخص غلبہ آ رہا ہے۔ اس فٹس کے پیچھے جنرل صاحب کا ہاتھ بلکہ زبان کار فرما تھی۔ سر حال یہ برداشت کر رہے تھے بعد کمپن کار نے کامیابی کی خبر سنائی اور پھر ہم نے ان کے چہرہ پر قطرہ قطرہ روشنی آتے دیکھی۔ ظاہر ہے کہ یہ روشنی بھی جنرل صاحب کا علیہ تھا۔

صبح جب بٹالین واپس آئی تو اپنے ساتھ چند اٹالوی اور جرمن قیدی بھی لائی۔ جنرل صاحب نے تمام افسروں کو شاباش دی۔ لائن کے آخر میں ہم بھی کھڑے تھے۔ ہم سے ہاتھ ملایا تو مسکرا دیے اور دوسروں کو سنا کر کہتا:

"رات ہم دونوں نے بھی ایک چھوٹی سی جگ لڑی تھی۔"

UrduPhoto.com

- 1۔ مہم ۶۶ میں کڑا
- 2۔ "کاپا ہے کاپا" مارا گیا۔ "..... یہ بڑی جگ میں کاپا سپاہیوں کے حلقہ انکرا استعمال ہوتا ہے۔"
- 3۔ Dully Deal یعنی بلی کا گوشت
- 4۔ بعد میں شکست کراں منظر۔ آج کل "کاپا" کھانڈے میں دیتے ہیں۔
- 5۔ کوئی خبر نہیں۔
- 6۔ کسی خبر کا نہ آتا ہی خوش فہمی کے برابر ہے۔
- 7۔ کلاک فوجوں کے درمیان کا علاقہ



## روز جنگ

۱۷ جون ۱۹۳۶ء کی صبح طلوع ہوئی تو اس میں افریقہ کے صحرا اور سیدی روزلیج کی پہاڑی کے لئے کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن سیدی روزلیج کے مورچہ بندوں کے لئے یہ صبح بڑی خاص صبح تھی کہ آج ان کی موت اور زندگی کا سوال پور بحث آتا تھا، لیکن ذرا پہلے پر۔ سردست مشرق سے سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ بارود چاند صحرا بندرچ ایک تپتے جیسے آوے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سیدی روزلیج کے غاروں سے ہمارے بریگڈ ہیڈ کوارٹر کے افسر اور عہدیدار رات کی ڈیوٹی ملتے فارغ ہو کر باہر نکلتے تو اپنی برساتیوں سے جو رات کو جہنم کے قطرے جمع کر رہے تھے، بچھا رکھتے تھے، چلو بھرائی جمع کرتے۔۔۔ ڈوب مرنے کے لئے نہیں تھیو کرنے کے لئے۔۔۔ یہ جہنم ہم صحرا نوردوں کے لئے من و سلوئی سے کم نہ تھی، ورنہ ہمارے پانی کے راشن پر حجامت کا بوجھ ناقابل برداشت ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میں سے کئی ایک نے اپنی داڑھیوں کی بے پناہ یلغار کے آگے استرے ڈال دیئے تھے اور اچھے خاصے آرج ہشپ نظر آتے تھے۔

ہمارے زمین دوز سگنل آفس سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ کبھی کوئی ڈی۔ آر (یعنی چٹھی رسال) تیز تیز لگتا اور موٹر سائیکل سنبھال کر ہوا ہو جاتا۔ کبھی اچھے دستوں کے ساتھ ٹیلی فون کی لائن کٹ جاتی تو فی الفور پانچ چھ جوان پسٹل سے تیار کھڑی لاری میں پھینٹے

گولوں اور بھڑکی سرنگوں سے بے پروا لائن کی حرمت کو چل گئے۔

دشمن کے مقابلے میں ہماری تین مائٹس تھیں۔ گڑھوال، راجپوت، راجپوت اور ساؤتھ ویلز بارڈرز۔ علاوہ انہیں پناہی سکین گاؤں میں جابجا ہمارے توپخانے تھے تو یہیں نصب کر رکھی تھیں۔ اپنے مورچوں کے سامنے ہم نے بارودی سرنگوں اور غاردار تاروں کا جال بھی بچھا رکھا تھا کہ دشمن کو ہمارا مورچہ حاصل کرنے کے لئے ذرا دامن سنبھال کر اور جان کی بازی لگا کر آگے بڑھنا پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ بغیر بازی لگائے ٹپٹے ٹپٹے سیدی رزلی کی بلندی پر آؤ گئے اور ہمیں مزاج پرسی کا موقع ہی نہ دے۔ ہماری سرنگوں کے پھوٹنے سے دشمن کے بے مالک زمین تھی اور اس بار لیڈ مارشل روٹ کی افواج اور اس کے بکتر بند ڈرون تھے۔

فریقین کو ایک دوسرے کی موجودگی کا نہ صرف علم تھا بلکہ کئی روز سے دور مار توپوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ٹیکہ ملنے لگے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ قرائن سے آج جرمنوں کی نیت میں معمول سے زیادہ فوج نکلا تھا۔ یعنی یوں جیسے حملہ کرنے والے ہوں۔ ویسے ہماری نیت کا بھی انداز ہی مالک تھا۔ اس لیے اس کی نیت سے ہمیں علم تھا کہ اس مدافعت کے یہ معنی تھے کہ ہم جرمنوں کے خلاف بعض پکنک کار اور رکھتے تھے۔ جی نہیں ہمارے جنرل شاف کو گمانہ بھی تھا کہ ہمارے ہاتھوں میں تو خاصے خاتم پھر تھے۔ فقط یہ کہ جنگی ضرورت کے تحت ان کا استعمال صرف اسی صورت میں کرنا تھا کہ جرمن پہلے ایٹم بم لگیں۔ اور یہ ایٹم بالآخر پچھلے ہر نازل ہوئی تھی۔

میں برگینڈ سٹیل آفس میں بیٹھا تھا۔۔۔ یہ "آفس" ایک گھرے عمارت تھی۔ کہ اچانک ہمارے ہراول دستوں نے وائرلیس پر جرمن حملے کی خبر دی۔ حسب معمول حملے کی ابتدا شدید گولہ باری سے ہوئی۔ جواب میں ہماری توپوں نے بھی ماحضروں کیا۔ جب یہ باہمی تواضع ذرا زور پکڑ گئی تو مختلف یونٹوں سے جنگی حالت کے متعلق فلی فون اور وائرلیس کے ذریعے پیغام آئے گئے۔ دو چار ہی پیغام پڑھے تو محسوس ہوا کہ کس قیامت کے یہ ہمارے میرے نام آتے ہیں۔ مجھے وہ لمحہ کبھی نہ بھولے گا جب وائرلیس پر ہمارے برگینڈ کے پہلے جوان کے مرنے کی خبر آئی۔ یہ ہمارے توپ خانے کا ایک گولہ اندوز تھا۔

جنگ کے دوران عموماً وائرلیس پر خطیہ زبان یعنی سائینیا کوڈ میں بیانات بھیجے جاتے ہیں جو بعض اوقات محض اعداد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ دشمن بات نہ سمجھ لے، لیکن جب لڑائی کا یہ عالم ہو کہ دست و گریبان کا معاملہ ہو تو پشیدگی کا تلفظ ہر طرف رکھ دیا جاتا ہے اور صاف ستھری انگریزی میں اطلاعات اور احکامات آنا جانا شروع ہو جاتے ہیں، چنانچہ لکھ لکھ جنگی حالت کی خبریں آتیں کہ دشمن کے ٹینک اس پستل سے بڑھ رہے ہیں یا فلاں مقام پر توپ کا فائر تیز ہو گیا ہے یا ہمارے اسٹے آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔ ٹینک کی فلاں جگہ ضرورت ہے۔

لیکن ایک مرتبہ ہمارے ایک یونٹ کمانڈر کو جنگی چال کے سلسلہ میں نہایت راز کی بات کہنا تھی اور فی الفور انکو کوڈ کرنے کی ضرورت تھی۔ صاف انگریزی میں بات کرتا تو قیامت فوٹ پڑتی۔ لہذا اپنی گوراشانی اردو میں بولنے لگا۔ ایک گوراشی سمجھ سکتا تھا اور جو جرمنوں کے فوجی دست ہلا تھی اور ہمارے پکٹ کمانڈر نے بھی اردو میں جواب دیا اور عارضی طور پر یہ راز کھلا کر کہہ دیا۔ یہ سارا معاملہ خفیہ ہی رہا اور کئی دن تار ہوا۔

سارے جہاں میں دھچک ہماری زبان کی ہے۔

(اگرچہ یہاں اردو دھوم مچانے کے لئے نہیں دھول ڈالنے کے لئے استعمال کی گئی تھی)

ہمارا برگینڈ سٹیل آفس میں بیٹھا تھا۔ دشمن کی دور مار توپوں کے گولے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے اور ایسا کرنے میں ہمیں زندگی بھر کے لئے ممنون کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ دراصل ہمارے استحفاظ کے لئے ہی بھیجے جاتے تھے اور اگر سرے گزرنے کی بجائے وہیں نازل ہو جاتے تو ہم نہ صرف مستفید ہوتے بلکہ متوفی بھی۔ ویسے ان گولوں کو ہم تک پہنچنے کے لئے عمار کی چھت چڑھنا پڑتی اور اتنی دھمت کے بعد انہیں ہم تک رسائی ہو جاتی تو مرنا عار بھی نہ تھا۔ یہ بھی اطمینان تھا کہ اکیلے نہ مریں گے۔ بہت سے یاران عمار کی رفاقت حاصل تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس عمار کی گمرانی میں ہم بے حد محفوظ تھے۔

ہمیں وہ رو کر ان جوانوں کا خیال آتا جو کھلے میدان میں ہم سے دو میل آگے توپوں اور

مٹین گھنوں کی زد میں بیٹھے تھے۔ ان کی صرف یہ فلاحی تھی کہ اگر اس گولے پر ہمارا نام نہیں لکھا تو ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اور اگر لکھا ہے تو چھپنے کا قاعدہ نہیں۔ یہ ہے ہماروں کی فلاحی۔ لیکن اس قلعے کا ذکر کرنا آسان ہے اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ یارانِ عار تقریباً سب کے سب ڈاکر تھے۔ عامل آگے تھے۔ ادھر رات بھر دشمن گولے برساتا رہا لیکن اپنے مورچوں سے نکل کر ہماری طرف نہ بڑھا۔ ہماری افواج تو خیر جس ہی دفاعی مورچوں میں اورو دشمن کی طرف پیش قدمی کرنے کا ہمارا ارادہ تھا نہ امکان۔

امن کے زمانے میں اس لقمہ ووق صحرای راتیں کس قدر خاموشی اور بے ہنگامہ ہوتی ہوں گی جہاں سینکڑوں میلوں تک کہیں آبادی کا نام نہ تھا۔ سیدی رزق "الدودہ" "العدم" وغیرہ محض بے جان ٹیلوں یا گھائیوں کے نام تھے۔ لیکن اب اس مردہ ریگستان کی تمام تر پستی رنگ و صوت کے وحشت خیز ہنگاموں سے بھر پور تھی۔ صوت : وہ توپوں کی مسلسل گز گزانت ہو بھی اس قدر دور کہ خواب معلوم ہوتا اور کبھی اس قدر قریب کہ نیلے کی آواز لینے کو ہی چاہتا۔ رنگ : وہ روشنی کے سرخ و سبز گولے جو ہر دو جانب سے مخالف افواج کو دیکھنے یا اپنی افواج کو اشارہ کرنے کی غرض سے چھوڑے جاتے اور وہ سرخ لائٹ کی لمبی روشن اگلیاں جو آسمانوں کی وسعتوں کو چرتی ہوئی ٹھکانے پیاروں کا تعاقب کرتیں۔ یہ رات تقریباً ساری کی ساری آنکھوں میں کٹی۔ لینے کو ایک پل بھی نہ ملا اور مٹا بھی تو اسے لیت کر گزارنے میں کچھ خوبی نہ تھی کہ ان حالات میں غن مسترانہ بات فیروز تھی بلکہ خود زندگی تھی اور زندگی بیداری اور حرکت سے عبارت ہے۔ اگر سو جاتے تو شاید سحری نہ ہوتی۔

صبح ہوئی تو جنگ بدستور جاری تھی۔ لیکن نہ دشمن آگے بڑھا تھا اور نہ ہی ہم نے مورچے خالی کئے تھے۔ ہمارا جانی نقصان بھی بڑھا تھا لیکن جو کھڑا ہمیں مسلسل لگا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ سیدی رزق کے جنوب میں سینکڑوں میلوں تک صحرائی صحرا تھا اور ہمیں ڈر تھا کہ دشمن کہیں ہم سے آنکھ بھا کر دور جنوب سے بڑھ کر مشرق میں ہماری پسپائی کا راستہ نہ لٹ وے۔ لیکن ہماری سادگی دیکھیں کہ ہم اس ناگوار امکان کا محض ذکر ہی کرتے رہے اور جرمنوں نے اس پر عمل بھی کر دیا یعنی تمام دن ان ٹی توپوں نے ہمیں جیسے باتوں میں لگائے رکھا اور چپکے

سے ان کا مشہور ۹۰ لائٹ آرمرڈ ڈومین بہت دور جنوب سے ایک قوس کی شکل میں مشرق کو ہمارے مقدم کے لئے بڑھنے لگا۔ کوئی غروب آفتاب کا وقت تھا کہ ہماری بالی کمان پر جرمن چال کا انکشاف ہوا اور فوراً ہمارے بریگڈ کو سیدی رزق چھوڑ کر سلوم کی طرف پسپائی کا حکم ملا۔

اب پسپائی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو نئی حکم ملا "ہر سپاہی اور افسر نے سر پر پاؤں رکھ کر پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ پسپائی ایک نہایت ہی دقیق جنگی چال ہے۔ اس میں ہر یونٹ ہر یکشن بلکہ ہر جوان کو ٹھیک سوچنے کے منصوبے کے تحت ایک خاص وقت پر اپنی جگہ چھوڑنی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ کسی اندری طرف سے دشمن پر گولہ باری شروع کر دی جاتی ہے کہ وہ پسپا ہونے والے یونٹ کو جگہ خالی چھوڑ دیکھ کر اس پر پل نہ پڑے۔ اپنے اور دشمن کے درمیان ہمیشہ فاصلہ رکھا جاتا ہے اور مختلف یونٹ ایک دوسرے کو خالق قاتل سے کر پیچھے لگتے ہیں۔ اس طرح مکمل بریگڈ کا پوزیشن خالی کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہمارے بریگڈ ہیڈ کو اڑنے لگا۔ جس میں یہ خاکسار بھی شامل تھا۔ پسپائی کی ابتدا کی۔ کوئی دس بارہ گولیوں کا ہلکا پھلکا سا کانوائے تھا۔ ادھر ساطی سڑک پلٹے بھی تھی اور سیدی بھی۔ اور ہماری قلعہ کا تقاضا تھا کہ اس صراط مستقیم پر جس تیزی سے بھاگ سکیں "بھاگیں"۔ چنانچہ بھاگنا شروع کر دیا۔

بھاگتے بھاگتے ہمارے شمال میں بحیرہ قزم تھا اور جنوب میں جرمن۔ قزم سے تو ہمیں ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن جرمنوں سے ہمارا بہت سا مفاد وابستہ تھا چنانچہ ہماری آنکھیں ان کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ دغنا "جنوب میں ہمیں روشنی نظر آئی اور ہماری دنیا تاریک ہو گئی کیونکہ یہ روشنی ان گولوں کی تھی جنہیں جرمن دستے فضا میں بلند کرتے ہوئے ہماری پیشوائی کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہم نے اپنی رفتار تیز تر کر دی۔ تیزی میں آکر ہمارا ایک ٹرک صراط مستقیم سے ہٹ کر رست میں پھنس گیا۔ ہمیں گمراہ ٹرک کو راہ راست پر لانے کی فرصت نہ تھی۔ اسے وہیں رہنے دیا اور سواروں کو دو سری گاڑی میں بٹھا کر فرار جاری رکھا اور آخر دشمن کے بیٹوں





## پسپانی بسوئے مینا کیمپ

اب سلوم میں ٹھہرا ہے۔ جزل ہیڈ کوارٹر قاہرہ سے حکم آیا کہ چار پانچ روز میں بریگیڈ کے پس ماندگان اکٹھے ہو لیں تو سرسبز کے قریب ایک کیمپ (Base Camp) میں مقیم ہائیں اور وہاں انہیں توڑ پھوڑ کر اور مزید کلک شامل کر کے ایک نیا بریگیڈ کھڑا کیا جائے۔ خود ہمیں تو توڑنے پھوڑنے کی حاجت نہ تھی کہ ہم پہلے ہی غاصہ کو بیدہ و بالیدہ تھے۔ سیدی رزلی کے دنوں میں جرمن حملے کا ساتھ خود ہمارے گلے نے بھی بغاوت کر دی تھی۔ گلے کی تکلیف خاصی تھی لیکن طرف بائیں ہی تھا جو جرمنائٹس کے مقابلے میں گد گدی معلوم ہوتا تھا۔ اب بڑی منزلوں سے تو سلام میں امان مل گئی تھی، لیکن اپنے گلے سے گلو خلاصی کے لئے ہسپتال درکار تھا۔ ہر چند کہ ہمارے بریگیڈ میں ایک فیلڈ امبولینس اور اس کے ڈاکٹر بھی تھے جو ہمارے قریب ہی خیمہ زن تھے اور میں اولین فرصت میں ان کے پاس گیا بھی، لیکن دیکھا تو ڈاکٹر لوگ سیدی رزلی کی کلست کے بعد اپنے بکر کے چاک ہی رفوتہ کر پائے تھے اور جج تو یہ ہے کہ ان کی حالت دیکھ کر یہ خاکسار اپنے گلے کا دکھ بھول گیا۔

ہوئی جن سے توقع خشکی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ حتم لٹے!

ہمارے گلے کے علاج کے لئے قریب ترین ہسپتال بمبلی تھا جو اسکندریہ کی بھل میں

تفصیل سن کر سکتے میں آیا۔ ہوا یہ تھا کہ ہمارے بیچ ٹکٹے کے بعد دشمن نے سڑک پر ایک روڈ بلاک لگا لیا اور تمام تر اسلحہ سے لیس ہو کر ہمارے بریگیڈ کا انتظار کرنے لگا اور جو نئی ہمارے لاری سوار جو ان قریب آئے۔ کم بخت نے گزروں کے فاصلہ سے ان پر گولہ اور بارود کی بارش کر دی۔ بے شمار سپاہی لاریوں کے اندر مارے گئے۔ جو نیچے اترے وہ وہیں ڈھیر کر دیئے گئے۔ فردا فردا یہاں بھی ہمارے جوانوں نے بمباری کا ثبوت دیا۔ ایک جوان کو ٹائی گن سے جرمن ٹینک پر حملہ کرتے دیکھا گیا۔ کئی ایک سگینیں تان کر جرمن مشین گنوں پر پل پڑے، لیکن یہ جوش دشمن کو مارنے کے لئے نہیں تھا، صرف عزت سے مرنے کے لئے تھا۔ تقریباً نصف سے زیادہ بریگیڈ تباہ ہو گیا۔ سینکڑوں جوان مارے گئے یا قید کر لئے گئے۔

اس کلست کا بدلہ آخر ہمارے چوتھے ڈویژن نے لیا جس نے آٹھویں فوج کی بٹالیا میں جزل ٹھہری کی قیادت میں حصہ لیا۔۔۔ لیکن جنگ کی درشتی کا صحیح احساس فتح میں نہیں، کلست میں ہوتا ہے اور ہمارا جنگ کا پہلا تجربہ ایک عمل کلست اور طویل پسپائی تھی جو فوجی نقطہ نگاہ سے ایک ناقابل فراموش اور قیمتی سبق تھا۔

میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا۔

۱۔ ہسپتال اور اس کے ارد گرد کا خطہ منی کلنا ہے۔

۲۔ ایک سی گاؤں کے رہنے والے۔

بحیرہ روم کے کنارے واقع تھا، یعنی کوئی تین سو میل پیچھے مشرق کو چنانچہ ہمیں حکم ملا کہ جس قدر جلد ہو سکے، بمبلی کے ہسپتال میں پہنچو۔

اب سلوم اور بمبلی کے درمیان کوئی بس تو چلتی نہ تھی کہ ٹکٹ لے کر بیٹھ جاتا۔ جنگ میں مقام الف سے مقام ب تک جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی Hitch-Hike اپنا مختصر سا اثاثہ لے کر جو ایک فوجی قبیلے پر مشتمل تھا، سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور مشرق کی طرف جاتے ہوئے پہلے ٹرک کو ہاتھ دیا۔ یہ صحرائی جنگ کے آداب میں سے تھا کہ کوئی سپاہی سواری کا محتاج ہو تو اسے شہادت کے بعد بلا تامل جگہ دی جائے۔ ہم نے ڈرائیور کو ہاتھ دیا اور کار ڈکھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ٹرک کو صرف مری مطروح تک ہی جانا تھا۔ اس مشہور صحرائی چھاؤنی میں پہنچے تو دیکھ کر حیرت بلکہ حیرت آنے لگی۔ نکست واقعی نامراد تھے۔ مری مطروح ہم نے جانی مرتبہ بھی دیکھا تھا۔ کیا چل پھل تھی! وہ آبادی نہ تھی وہ شہر تھا! میں وہ آسودہ چرے اور وہ بے ہودہ گھیس۔ مری مطروح زمانہ امن میں ایک اطالوی چھاؤنی تھی، قذافی کے لٹاک سے پہلے ہی اس پر آسائشیں بڑی بڑی سیر تھیں۔ اطالوی افسروں اور عسکریوں کے متعلق مشہور تھا کہ جنگ کے علاوہ ہر فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے دیگر کمالات کی مثال کا تو ہمارے پاس وقت نہ تھا، لیکن فنِ تعمیر میں انہیں واقعی یکساں پایا۔ کم بختوں نے صحرا کو بھشت میں بدل دیا تھا۔ مری مطروح کو تو جانے دیں کہ زمانہ امن کی پیداوار تھا۔ مین جنگ اور مین صحرا بھی یہ خوش مذاق اطالوی اپنے مورچے اس غصت سے کھودتے تھے گویا تاج محل تعمیر کر رہے ہوں اور اطالوی افسروں کے لوازمات زندگی کے پیش نظر شاید محلات کی ضرورت بھی تھی۔ یہ پچھلے سال ہی کی تو بات تھی کہ جب ہمارے جوانوں نے اطالوی مورچوں کو جا دبوچا تو اندر سے جہاں ہر اطالوی افسر ہاتھ بلند کئے باہر نکلا وہاں ساتھ ہی ایک جوان لڑکی بھی ہاتھ کر رہے رکھے برآمد ہوئی۔ نفیست کے اس مالِ لطیف نے شروع میں تو کچھ عجیب مسائل پیدا کر دیے کہ ہماری فیلڈ بک میں اس موضوع پر کوئی ہدایت نہ تھی، لیکن جلد ہی ہمارے کمانڈر کے حسن مذاق نے اس کا واحد تسلی بخش حل ڈھونڈ نکالا۔

ذکر مری مطروح کی بے رونقی کا تھا۔ صرف چند ہفتے پہلے مطروح کا ہر گوشہ کف محل فروش تھا، مگر اب کہ ہر لکھ روپے کے منے کا ڈر تھا، اس کے گلی کوچوں میں ہر چند قدم پر غاروار تار کے دیو قامت گولے لٹکا دیے گئے تھے جن سے دست و پای نہیں دیکھ دو دل بھی جموج ہوتے تھے۔ پسپائی کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور جنگ میں پسپائی سے زیادہ یاس انگیز کوئی چیز نہیں ہوتی۔ محافلین مطروح بے حد متحمل نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں رات کو میٹھی نیند یا سانسے خوابوں کی توقع بیکار تھی، چنانچہ جوں توں کر کے مری مطروح میں ایک افسرہ نئی حالت گزاری۔ دوسرے دن علی الصبح بستریانہ حال اور اس حسرت کدے سے نکل کر لاریوں کے ریکڑ چلانے لگے اور کافی دیر بیٹھا کئے۔ اٹھائے جانے کا تو خوف نہ تھا کہ کوسوں تک دیر تھا نہ حرم، اور تھا نہ آسائش، بلکہ آخر مغرب سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کی منزل العالمین تھی۔ اسی میں بیٹھ گئے اور العالمین پہنچے، چننے شام ہو گئی۔

العالمین میں صرف ایک باغ تھا اور وہ بھی چھوٹا سا۔ رات ان کے ساتھ بری۔ ان دنوں العالمین ایک غیر معروف مقام تھا اور ابھی یہ بات اس سستان سے قریب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ صرف چند ہی ماہ بعد ٹھکری اور رول اسے تاریخ کے صفحات میں دوام بخش دیں گے۔ بہر حال ہم نے العالمین کی رہائش کا تاریخی فخر العالمین کے زمانہ ماحول تاریخ میں ہی حاصل کر لیا۔

دوسرے دن علی الصبح اسکندریہ جاتے ہوئے ایک اور فوجی ٹرک مل گیا اور شام کو ہمیں بمبلی کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز ذی القور ہمارے گھر کا آپریشن کر دیا جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے دیکھا تو گھر میں ذرا سا پینٹ لگا دیا اور فرمایا کہ ہفتہ بھر غرارے کرو اور اسی دن ڈسچارج کر کے قاہرہ ری انفور منٹ کیپ میں بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے زبان سے تو نہ کہا، لیکن ان کا مطلب واضح تھا کہ جنگ جاری ہے۔ محض گھر کی خرابی سے تداروری کی عیاشی نہیں کرائی جاسکتی۔ ابھی جنگ لڑو۔ بچ گئے تو گھر کا علاج ہونا رہے گا اور کام آگئے تو فرشتے تمہارے لئے بہشت یا دوزخ کا فیصلہ لگا دیکھ کر نہیں کریں گے۔ قصہ کو تاہم دوسرے روز ہم قاہرہ کے قریب ری انفور منٹ کیپ میں پہنچ گئے۔

پھر بھی مینہ بھرا تحم زندگی بسر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

حاصل ہو چکا تو اردلی ایک صاف ستھری ٹرے میں چائے رکھ کر لایا۔ ساتھ ہنست اور سیب بھی۔ یعنی یہ سب تکلف اس شخص کے لئے ہو رہا تھا جو کل تک ملی دین بشمول ریگ صحرا پر گزارا کرتا تھا۔ اپنی خوش بختی پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ کہیں کسی ٹکرک کی غلطی سے ہمارا نام نیم نشینوں کی بجائے جرنیلوں کے خانے میں تو نہیں لکھا گیا تھا؟ بہر حال ایسی غلطی اگر کہیں ہوئی بھی تھی تو اس کا پکڑنا کسی جرنیل کا کام تھا۔ بالکل ہمارا کام اس چائے کو پینا تھا۔ دھیرے دھیرے پینا تھا اور پی بھر کر پینا تھا۔

چائے کے دوران اردلی سے مزید تعارف ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کا رہنے والا ہے۔ ہماری طرح جنگ کی ابتدا میں بھرتی ہوا اور اپنے کمالات کے مظاہرے کے لئے کینٹرنگ کور کا انتخاب کیا یعنی فنی میسوں اور لنگر خانوں میں خدمت کرنے لگا۔ شکل و صورت سے پورا رام پورا کی خدمت میں نظر آتا تھا۔ اس کے اردلی پن میں گویا شیت ایزوی جھک رہی تھی۔ کار خدمت میں وہ شوق اور محنت شائق میں آئندہ پیشانی۔ یہ شیت ہی کا توفیق تھا۔ پورا رام نے ہمیں پہلی ملاقات پر ہی رام کر لیا۔ باتوں باتوں میں بولا:

"صاحب شام کو کیا کھائیں گے؟"

اب کھانے کے معاملے میں میسوں میں رہنے والوں پر مختاری محض تحت ہے جو خداوندان میں چاہے ہیں سو کرے ہیں۔ ہم نے کہا:

"پورا رام، جو میس میں کپے کا کھانا پڑے گا اور کھائیں گے۔ ہماری پسند کیا معنی؟"

بولا: "اگر اجازت ہو تو آپ کے لئے علیحدہ دہرا سی وال پکاواؤں؟"

اب مجھے پورا رام کی وال کھانے کا ایسا شوق نہ تھا اس لئے میں کہ ایک ہندو کے کپے ہوئے کھانے سے میرے اسلام کو کچھ خطرہ تھا۔ آئینہ میس میں کوئی ملازم دھبہ باندھنے کے اعتبار سے اچھوت نہ تھا۔ مجھے اعتراض تھا تو وال پر۔ کیونکہ وال سے میرا اسلام واقعی خطرے میں تھا۔ مجھے پیشہ خدمت رہا ہے کہ اگر مسلسل وال کھائی جائے تو مسلمانی زائل ہو جاتی ہے۔ بہر حال پورا رام کی دل شکنی منکھور نہ تھی۔ کہا: "پکاواؤں۔"

سرکاری مقصد یہ تھا کہ ایک ہفتے کے آرام کے بعد ہمیں حسب ضرورت جنگی استعمال میں لایا جائے۔

قاہرہ کا یہ مشہور ری انفور منٹ کیپ مینا کیپ کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ اسی نام کے علاقے میں قاہرہ شہر سے کوئی دس میل دور اہرام مصر کے سامنے واقع تھا۔ کیپ میں پہنچے تو اس کے حسن انتظام کا فوری احساس ہوا۔ گاڑی سے اترنا تھا کہ ایک صوبیدار صاحب مع چند سپاہیوں کے استقبال کو بڑھے۔ فی الفور ہمارا سامان خیمے میں پہنچایا گیا اور خود ہماری وہاں تک رہنمائی کی گئی۔ خیمے کے دروازے پر ایک سیاہ قام مکر صاف ستھرا اور چمکدار ہتھیار کا جسم سپاہی کھڑا تھا۔ بولا:

"میں سپاہی پورا رام ہوں، آپ کا اردلی۔"

خیمے کے دروازے سے پورا رام کا ظہور اس قدر چمک ہوا تھا جیسے الہ دین نے چراغ رکھا ہو اور دھوئیں سے ایک لافرماجن نمودار ہوا ہو۔ پورا رام نے ایک خامس اردلیانہ ادا سے حق الثانی اور ہم خیمے میں داخل ہوئے۔

کیا ستھرا اور کشادہ خیمہ تھا! درمیان میں چنگ، لکڑی کی میز اور کرسی، اس طرف ڈرائنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری۔ خیمے کے سامنے کی دیوار میں دروازہ تھا۔ پردہ اٹھایا تو ایک دہرے مگر چھوٹے سے خیمے میں کھلا۔ اندر کی چیزیں دیکھیں تو چھوٹے سے خیمے میں کچھ رہا ہوں۔ تین بائیاں بٹا ہر پانی سے بھری پڑی تھیں۔ سسے سے ہاتھ لگایا تو بج پانی تھا۔ صحرا کی جنگ کے بعد ہمیں چلو بھر سے زیادہ پانی پینا دیکھنے کی توقع نہ تھی۔ اب نہ صرف بائیاں پانی موجود تھا، بلکہ اس کے استعمال پر اعتبار بھی تھا۔ بے اعتبار اپنی خوش نصیبی پر کسی واضح ڈھنگ سے باز کرنے کوئی جاہا۔ مثلاً ایک والمانہ رقص سے، جیسے ہنسنے فتح فرانس کی خبر ملنے پر کیا تھا، مگر پیچھے اردلی دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے رقص کرنے میں اپنے عہدے کی سطوت مانع آئی: (ہنر مند کے لئے خاص سے ہم سے بہت جو نیز تھا۔ وہ کارپول، ہم نیم نشین!) فدا تاج سے تو گریز کیا، آٹا فانا کپڑے اتارے اور ایک انتہائی سرور انگیز غسل سے داد پیش دی۔ بعد کی زندگی میں اس سے زیادہ ملکت غسل بھی کئے مگر وہ سرور نہ حاصل ہو سکا کیونکہ

ایک قاب تھی۔ ہمارے سامنے رکھ کر اوپر سے پردہ سرکایا تو ہائوس انگریزی کھانے کے پہلو پر پہلو ایک سبز مڑوں میں لمبوس پیٹ نظر آئی۔۔ یعنی بابو رام کی تخلیق ہمارے وال! لیکن گمری سبز اور تھ مڑوں کی دید سے ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کا تار چھو لیا ہو۔ بابو رام ہماری سراسیمگی دیکھ کر بولا:

”دال مڑوں کے نیچے ہے۔ آپ صرف دال بھی کھا سکتے ہیں لیکن مڑوں کا بھی ساتھ دے دے تو وہ آتش ہو جائے گی۔“

دل سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک آتش پر ہی اکتفا کرنا قرن مصلحت ہے چنانچہ مڑوں سے قطع نظر کر کے بابو رام کی دال سے ہم اللہ کی۔ پہلے تھے کے ساتھ ہی ہمارے اندر زندگی نے کوٹ لی۔ بخدا یہ کوئی مومک نہ تھی دال حیات تھی۔ اس شب ہم نے انگریزی کھانے پر ہر چند کہ توجہ دی تھی۔ اور اس کے بعد جتنے دن مینا کیپ میں رہے بابو رام کی دال سے محروم رہنا گوارا نہ کیا۔ کھانا کھا کر ہمیں ہمارے مسلمان کا تعلق تھا اس میں ایک نئی تازگی اور تابندگی محسوس ہونے لگی۔ اور وہ جو مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے کہ دو چار دن مومک کی دال کھاؤ تو اردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشہ تہارت کی طرف مائل ہوتی ہے کسی اور دال کی بات ہوگی۔ ورنہ اگر ان کا روئے سخن بابو رام کی دال کی طرف ہے تو یہ ممکن ہے۔ اگر جناب یوسفی مینا کیپ میں میرے ہم نوالہ ہوتے تو آج وہاں سے ہٹتے ہٹتے کے علاوہ صاحب دیوان بھی ہوتے اور بیک کی بجائے کسی بریڈ کی کمان کر رہے ہوتے۔

۱۔ اس انگریزی ڈیپ کا نام کوئی زیر نہیں۔ اگر آپ نے انگریزی نہیں چمکی تو کوئی بریڈ نہیں دیتے ہاں سنی کھانے میں نہیں ہے۔

بابو رام نے کہا: ”شام کا کھانا بیس کی بجائے نیچے ہی میں کھائیے گا۔“  
یہ مزید عیاشی تھی۔ دعوت قبول کی اور ایک آسوگی اور فراغت کے احساس سے نیچے سے باہر نکلے کہ تھوڑی سی مینا کیپ کی سیر کر لیں۔

بھرے والے شاہد کیپ کی طرح مینا کیپ بھی ایک شہر تھا جس کے مختلف حصے تھے۔ برطانوی ونگ، ہندوستانی ونگ، پٹن کا محلہ، توپ خانے کا محلہ، وغیرہ وغیرہ۔ کیپ میں ہندوستانی افسروں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ ان سے ملاقات ہوئی تو گفتگو قاہرہ اور اس کی دلچسپیوں کے گرد ہی گھومتی رہی۔ جسے دیکھو، غذائے قاہرہ۔ کوئی گراہی کا دلدادہ کوئی پادشاہ کا شیدائی۔ کسی پر کاٹنی فینیل کا جادو اور کوئی شہر کا پرستار۔ ان جیسوں کی ترکیبوں کے قصبے کچھ اس اشتعال انگیز انداز میں سنائے گئے کہ اسی ساعت کا چوڑی مست ہوا ہو جانے کو مئی چاہا۔ اور قاہرہ کوئی دور بھی نہ تھا، یہی دس بارہ میل۔ شوک پر کھڑے ہو جاتے تو کوئی گاڑی یا جیسی قاہرہ جاتی ہوئی مل ہی جاتی۔ مگر یہ کہ کیپ کے کلین افسر سے رخصت لینا لازم تھا اور ہم نے ابھی بمشکل اپنی آمد کی رپورٹ دی تھی۔ سو قاہرہ جانا کسی دوسرے وقت پر غار کھانا۔ کیپ دیکھتے دیکھتے شام ہو گئی۔ اپنے نیچے کو گھسنے۔ اندر داخل ہونے کے لئے جتن اٹھانا چاہی تو وہ خود بخود اٹھ گئی۔ دیکھا تو جتن کے پردے میں بابو رام بول رہا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو خیمہ بیکار رہا تھا۔ بابو رام نے سرکاری بلب کے علاوہ ایک غیر سرکاری بلب بھی لگا دیا تھا اور ہماری غیر حاضری میں ایک چھوٹا سا قالین بھی پیدا کر لیا تھا۔ میز پر ایک گلدستہ سجایا تھا اور ساتھ تپائی پر مشروبات کی بوتلیں اور بلور کے جام چن دیئے تھے۔ ایسا ہندوستان ہم نے پشاور چھانڈی میں بھی کم دیکھا تھا۔ ہماری دشت بپائی کا صلہ دینے کے لئے سچ کوئی فراخ دل بلکہ فضول خرچ فرشتہ مقرر ہوا تھا۔ پھر نصرت! بابو رام نے جیسے ہمارے دل کے اندر جھانک لیا ہو۔ آگے بڑھ کر وہی مشروب تیار کیا جو ہمارے دل میں تھا اور ہم ایک پختہ اور خراٹہ جرنیل کی طرح اسے جرد جرد پینے لگے۔ بابو رام اس خاموشی سے غائب ہوا کہ ہمیں احساس تک نہ ہونے دیا۔

کوئی آٹھ بجے کا وقت ہو گا کہ بابو رام نیچے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں



پاشاؤں کے باطن کے حالات تو خدا ہی جانتے۔ اور خدا کے لئے یہاں جانے کو بہت کچھ تھا۔ لیکن ان کا بیرونی منظر بہت حد جاذب تھا۔ قاہرہ کی تمہید واقعی حسب توقع تھی۔

آگے چل کر دریائے نیل کا پل عبور کیا تو گویا قاہرہ کے دروازے پر دستک دی۔ اوہر قاہرہ نے زندگی سے بھرپور جواب دیا۔ عورتوں اور مردوں سے بھرے ہوئے بازار۔ مرد اکثر فوجی، ہارودی اور غیر ملکی، لیکن ذرا کھوئے کھوئے سے۔ گویہ کھٹا مشکل نہ تھا کہ کس چیز کی تلاش میں ہیں۔ عورتیں اکثر مصری، انداز لباس اور آرائش گیسو میں بے حد مغرب زدہ۔ مگر ایک خاصی تعداد انگریزوں، مغرب کی بھی تھی جو خاکی وردیوں میں سینہ تان کر مصر کے بازاروں میں اکٹو سروس بیٹھلا رہی تھیں۔ مجموعی طور پر زنانہ اور مردانہ فوجیوں کی اس قدر کثرت تھی گویا اصلی جنگ صحرائے لیبیا میں نہیں بلکہ قاہرہ کے بازاروں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور فوجی بھی ہر ملک کے۔ ہندی۔ برطانوی۔ آسٹریلوی۔ کینڈائی۔ نیوزی لینڈی۔ یونانی۔ افریقی۔ فرانسیسی۔ پولستانی۔ الغرض، ظہور کے تمام تر قسم ہر مصر میں آج ہوئے تھے اور ہر طرف سے بائے کھل اور ہائے دل کی صدا ہمیں اچھری رہی تھی۔

قاہرہ کی دکانیں جنگ کے باوجود جملہ سالانہ عشرت سے آراستہ تھیں۔ ریستورانوں اور تفریح گاہوں میں وہ ہجوم خلق کہ کھوئے سے کھوا چھلکا تھا۔ بلکہ بعض خواتین و حضرات نے تو گویا اپنے شانوں کا صحیح استعمال ہی یہاں آکر سیکھا تھا۔ قاہرہ میں جنگ کی فقہ دو علامات تھیں۔ ایک یہی دکانوں کے سامنے رست کی پوریوں کے پٹنے کہ، سبباری میں سپر ثابت ہوں اور دوسرے بلیک آؤٹ یعنی سرشام ہی روشنیوں کو گل کد بتایا ہم رکھنا کہ دشمن کے ہوائی جہازوں سے قاہرہ کا پردہ رہے۔ لیکن علامت جنگ بہر حال علامت ہے، جنگ نہیں، اور اوہر بے شمار ایسے فوجی تھے جو قاہرہ میں محض بزم یک شب متا کر جی جی صبح نماز جنگ کو جا رہے تھے اور اس ایک رات کی مختصر سی فرصت میں زندگی کی تمام تر آسودگیوں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اور انہی کی خاطر قاہرہ نے قارون کی طرح گویا راستے میں خزانہ لٹا رکھا تھا۔ بدھرو دیکھو، مہ رخوں اور زہرو دشوں کے پرے، جو نہ صرف تعداد بلکہ شوق میں بھی مسافر فوجیوں سے ایک قدم آگے۔ اول تو سر راہی نظریں لاجباتیں، 'ورنہ کسی رقص گاہ کا نکٹ

## قاہرہ ایام جنگ میں

• دوسری صبح ایک گہری، مٹی اور لسی نیند سے بھرپور اور مین اسی لمحہ باورام چائے کی صوبی لے کر خیے میں داخل ہوا۔ بیداری اور چائے بیک وقت کیونکر تصور میں آئیں، میرے فہم سے بعید تھا۔ ان اسرار کو باورام بیسار دھانے رازی کھول ملکا تھا، لیکن میں یہ راز کریمہ کر باورام کی الہامی ہیرا گیری کا انداز نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر تازہ وردی پہن کر کیک کے ٹکڑے میں گیا۔ ایڈجوٹ صاحب کو حاضری دی۔ کمانڈر صاحب سے مختصر اور خوشگوار سی ملاقات ہوئی۔ یعنی ہمیں بتایا گیا کہ بختہ بھر کے لئے ہر قسم کی ڈیوٹی معاف ہے اور یہ کہ بختہ بھر ہم اپنے ساتھ جو سہلک چاہیں کر سکتے ہیں۔ یعنی چاہیں تو تصور جانیں میں دن بھر لینے رہیں اور چاہیں تو تلاش جانیں میں اہرام مصر پر چڑھ دوئیں۔ یہ دوسری حرکت ہم نے کی بھی، لیکن کافی عرصہ بعد میں۔۔۔ سردست ہمارے دل میں قاہرہ بستا تھا۔ ایک دو لسی افسر اوہر جا رہے تھے، ان کے ہر کاب ہوئے۔

میتا کپ سے نکلنے ہی کار ایک کشادہ، بلند اور دلکش سی شاہراہ پر آٹھل۔ یہ میناروڈ تھی جو اہرام اور قاہرہ کے درمیان شمالاً جنوباً واقع ہے۔ اس کی دس میل کی لمبائی میں دونوں طرف متوال پاشاؤں کے ولا (Villas) تھے جو باغوں کے لامتناہی سلسلے میں واقع تھے۔ ولاؤں اور

سادگی تھی یا پرکاری، خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن جہاں تک عشاق کی نیت کا سوال ہے، کچھ ہم بھی جانتے ہیں۔ ان کشمکش محبت میں صرف ایک آدمی سارہ ہو آقا، باقی ننانوے فی صد اچھے خاصے پرکار عاشق تھے۔ کیونکہ بہت کم افسر ایسے تھے جو قاہرہ کا رخ کرتے وقت جب میں دس بارہ انکشتیاں نہ ڈال لیتے!

لیکن گرائی کی پہلی شام کا ناقابل فراموش واقعہ حسینان مصر کی دلنوازی نہ تھی بلکہ ایک عالم دین کی زیارت۔۔۔ گرائی کے بار پر کھڑے تھے اور حسب توفیق نرم و درشت مشروبات سے دل بہلا رہے تھے کہ صدر دروازے سے ایک مولانا داخل ہوئے۔ یوں جیسے داغ کی غزل کے کوئی شعر نئی آنکھ میں آئے۔ بے حد متعجبانہ علیہ 'متشرع' داڑھی اور پادشہ چہرہ، سر پر سرخ تریوش اور سفید عمامہ، ہاتھ میں ایک پر اجلا اور لمبا جب، 'بائیں ہاتھ میں قبیع اور دایاں خالی۔ شاید اس لئے کہ دورہ استعمال کرنا چاہتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حاضرین سے مسلمانوں کو الگ کر کے کو قتل کے سپرد کریں گے کہ سے خانے میں کھڑے پائے گئے، لیکن جناب شیخ بارہ کے قریب آئے تو فوراً الٹ کر آگے سے فروش سے آنکھیں چار ہوئیں۔ پھر ایک حیرت انگیز مسکراہٹ آپ کے چہرے پر پھیل گئی اور ایک مقدس آسمانی آواز میں بار میں کو مخاطب کرتے ہوئے ہوئے:

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ"۔۔۔۔۔ واحد و یکتا۔

بار میں نے تعجب اور شادی اور جام و سکی پیش کیا۔ جناب شیخ نے جام تھا۔ پہلے اس آواز سے کہہ دیا کہ آکھوں ہی آکھوں میں پی رہے ہوں۔ پھر آنکھیں بند کر لیں 'جام کو لبوں تک لائے اور پھر جس لطف 'جس سکون اور جس حسن سے گھونٹ گھونٹ پینے لگے کہ نہ مشق یکساہروں کے دل مود لئے اور ہمدیوں کو سے نوشی کا حرف آخر پڑھا دیا۔

اس بات کے اعتراف سے ہمیں پاک نہیں کہ اس رات گرائی کی رنگینیوں نے ہمیں مغلوب کر لیا اور جب کہیں پچھلی رات کیپ میں پہنچ کر بستر پر دراز ہوئے تو گرائی کے ہنگامے خواب میں بھی ہمارے دماغ سے محو نہ ہو سکے۔

رہا خواب میں ان سے شب بھر وصال

لے کر فطرت داخل ہونے کی ضرورت تھی اور پھر بقول اکبر:

یاں جوانی کی انگ اور ان کو عاشق کی تلاش

ہمیں اپنے ملک میں یہ کیفیت ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ ذرا ان ملکوں سے پوچھیں جو جنگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ اخلاق اور مصمت جنگ کے اولین شکار ہوتے ہیں اور کسی کو برائی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ہمارے ساتھی کہ راتوں رات سم حبل سے بے خبر نہ تھے گرائی میں داخل ہوئے۔۔۔ گرائی شارع سلیمان پاشا کی مشہور رقص گاہ تھی۔۔۔ اندر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا گویا بیت کو دے کا در کھلا۔ گرائی کے کشادہ دروازوں میں سینکڑوں مرد اور عورتیں مصروف اشتغال تھے۔ دخت بیٹہ پر ایک نئی دھن کی ابتدا ہوئی اور مردانہ رقص لے کر اپنی پسند کی خواتین کے آگے جا بیٹھے۔ ہم نے یہ التجائیں روہوتی بھی دیکھیں، لیکن اکثر نے شرف قبولیت حاصل کیا۔ بلکہ کئی خواتین تو اس بے تابی سے طالبان رقص کو تار و پود ہی ہوتی تھیں کہ التجا بھی ان کے لبوں تک پہنچی ہی نہیں اور اجابت از دور حق بہر استعمال ہی آئی۔ یہ لازمہ تھا کہ پسند کی خاتون سے پیشگی تعارف بھی ہو۔ مغربی رقص کے آداب نے اجنبی کو بہت کچھ حقوق دے رکھے ہیں، چنانچہ تعارف اکثر رقص کے دوران ہی ہوتا اور بار بار ایسا ہوا کہ رقص کرنے کو اٹھے تو اجنبی اور کر کے پیسے تو رفیق بلکہ رفیق زندگی!

شاید یہ زمان مصر کا شیوہ ہے کہ دل دینے میں بہت شتابی کرتی ہیں۔ خصوصاً قطعی اور یودی۔ اگرچہ مسلمان لڑکیاں بھی ایسی ست مزاج نہ تھیں۔ خصوصاً جہاں معاملہ فوجیوں کے ساتھ ہو۔ آخر اس نیک روایت کی بانی مصر کی خاتون اول یعنی قتلہ پطروسی تھیں۔ لیکن دور حاضر کی دو چیزائیں کہیں زیادہ باوقاف تھیں۔ گواہی ہی زیادہ بودی تھیں۔ اگر پہلی ملاقات پر ہی کسی نے انکو غمی پسندی یا فطرت دکھائی دی تو فوراً شوق سے ان کے چہرے تھمنا اٹھتے تھے اور جیسے کوئی دیرینہ حسرت پوری ہو گئی ہو، چلا کر کہنے لگتیں:

"خاتم! خاتم!"

اور پھر کسی رسی نخرے کے بغیر بیان و قیام ہوتا شروع کر دیتیں۔۔۔ یہ حسینان مصر کی

مرے بخت جاگے میں سو یا کیا

ہمیں قاہرہ میں آرام کے لئے سات دن ملے تھے۔ یہ آرام ہم نے مسلسل قاہرہ ٹوری میں حاصل کیا کہ اس کے بعد ہمیں بظہر قاہرہ کی تفریح یا شاید زندگی کی ہی مسلت نہ دے اور قاہرہ میں دیکھنے کو کیا کچھ نہ تھا!

----- وہ غیر فانی اہرام اور ابو الوول، لیکن اہرام سے زیادہ ہمیں اس ترجمان نے متحیر کیا جو لگا تار ایک محض فصیح انگریزی میں تاریخ اہرام پر یوں رہا اور خود خاک نہ سمجھتا تھا کہ کیا کلمہ رہا ہے۔ اور ترجمان سے بھی بڑا بگڑا وہ مصری جوان جو پانچ منٹ میں اس کا کلمہ بول گیا اہرام کی چونٹوں کو ہاتھ لگا کر سالم اتر آتا تھا۔

----- وہ قاہرہ کا کوہ بیکر حصار جو کئی خوشنویس کا گلاب دیکھنے کے بعد اب نمبر 15 انڈین ہاٹل میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا اور جس کی بڑی کشش اس کے تاریخی مقامات نہ تھے بلکہ ہسپتال کی بد قیصر اینگو انڈین نرسیں جو محنت مندوں پر مویان اور مریضوں پر ناموسان تھیں۔ اور وہ خاص نرس جسے اس خاکسار نے انہی گورکھا جیوں کو دایم ذل کہتے سنا تو بلا اختیار ہر طرف کر کے ہسپتال سے باہر کیا اور چند میں خود ہر طرف ہونے سے ہل ہل بھا۔

----- وہ قلعہ کی بلندی پر چمکتا ہوا بیتا یعنی مسجد محمد علی۔ وہ رنگ و سنگ کا معجزہ فخر جس میں نمازی کم اور سیاح زیادہ آتے تھے۔

----- وہ مقلی بازار وہ تنگ و تاریک سی لکیر جس کی پر اصرار و کانوں کے سامنے جو نند گان عجائبات حیوانیوں کی طرح دیکھتے پھرتے تھے۔

----- وہ موسم کا عجائب خانہ جس میں داخل ہوتے ہی مرحوم سعد زاقول پاشا بتید حیات کھڑے نظر آتے تھے۔

----- وہ شہر اور کائناتی نینسل ہوٹلوں کی ٹیریس جہاں بلیک آؤٹ کے سائے میں گناہوں کے ابتدائی سوے ہوتے تھے اور پھر قاہرہ کی ٹیلیوں میں سارے شر کو لپیٹ میں لے لیتے تھے۔

----- وہ جزیرہ ریس کلب کی گھوڑ دوڑیں، جہاں پہلے روزی ایک گورے کیپٹن اور

ایک گورے سمجھ کی شپ پر پورے چالیس دنار جیت لئے اور بعد میں جب ان افسروں سے تفصیلی تعارف ہوا تو ایک پرنس علی خان نکلے اور دوسرے ڈگلس فیر بنکس جو نیز اور جن کے ساتھ چند لکھوں کی ہم نشینی کا حسینان قاہرہ پر یہ اثر ہوا کہ ہمیں بھی اپنے دائرہ نوازشات میں شامل کر لیا۔ شاید اس موقع کے تحت کہ گندم اگر بجم نرسد ہمیں غنیمت است۔ اور خدا گواہ ہے کہ ہم نرسے ہمیں بھی نہ تھے۔ سینکڑ لکھتے ہونے کے علاوہ چند اور ٹھوس خوبیوں کے مالک بھی تھے۔

----- وہ نیل کے کنارے عین دستور ان جس کی فحشیں گلاب کی جھاڑیوں کی اوٹ میں جتنی تھیں اور سر شام ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے عالیت جو جوڑوں سے پر ہو جاتی تھیں اور اسی عین کی وہ شام عجب ہمارے دوست دریا اور ہم پر نزول الطاف ہوا۔ لاریب اس شام نے ہمیں ایک لازوال دولت سے مالا مال کر دیا، مگر خدا را ہم سے اس دولت کی تفصیل پوچھنے پر اصرار نہ کیجئے کہ اس دن کے بعد اس شام کا جب بھی کسی نے ذکر چھیڑا، ایک تھرا لیا جیسے میں مارا کہ ہائے ہائے

----- اور وہ بیتا روڈ کی ٹائٹ گلاب آبر ذکر جس کی کشش وہ مخصوص قسمی رقص نہ تھا، بلکہ اس رقص و سرود کا سر پرست اعلیٰ یعنی شاہ قاروق جو کلب کے شاہ نشین سے اپنے مقربین کے ساتھ دایم رقص و سہ دیتے اور ہم جیسے ہزاروں پست نشینوں کو شرف زیارت اور درس عبرت دیتے کہ شاہ ملک و دین کا انداز واد بجائے خود ایک تماشا تھا یعنی ہر رقص کے بعد آپ رقصہ کو بلا کر اپنے پلو میں بٹھاتے اور دست خاص سے اس عارت گردین و ایمان کو جام سے پیش کرتے۔ پھر التفات شامی مسکراہٹوں، گندم گدیوں، قہقروں، بنگلیوں اور کبھی کبھی ہلکے بوسوں میں جلوہ گر ہوتا۔ یہ الف لیلہ کی بلا شامی معلوم ہوتی تھی اور تھی۔

----- وہ جامد از ہر کہ جس کے مقف ووالان ہزار شوق سے دیکھنے گئے اور لوٹنے تو اس کی تاریخی عظمت سے مرعوب تھے لیکن موجودہ وقیانویت سے ماخوس۔ جامد کے طلباء سے تبادلہ خیالات ہوا تو حضرت علامہ کا مصلح یاد آیا۔

اے مسلمان! اپنے دل سے پوچھ، خلا سے نہ پوچھ





کی آنکھوں کی روشنی ایک آنکھیں شعلے میں تبدیل ہو گئی۔

قاروق ابھی وہ لفظ بھی نہ کہنے پائے تھے کہ صوبیدار صاحب نے اپنی جگہ پر ہی یعنی میری بغل سے اللہ اکبر کا نعرو بلند کیا۔ قاروق اس دخل و در معطلات سے پہلے تو ذرا ٹھٹھک سے گئے لیکن معائن کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا اور تمام پائے کھٹکھٹا اٹھے۔ تاہیں بچتا شروع ہو گئے۔ صوبیدار صاحب نے یہ دیکھا تو کبھی کہ مصرع فرمایا ہے۔ گئے ہاتھوں ایک مزید نعرو لگایا، مگر وہ فور جوش سے گئے پر معمول سے زیادہ زور دے دیا۔ آواز بھگولے کھانے لگی۔ قاروق اور ان کے حواری ہنس ہنس کر دوہرے دوہرے تھے۔ بکری پاشا بھاگے بھاگے آئے اور میرا شکریہ ادا کیا کہ تمہارے سپاہیوں نے جلالت الملک کو آمادہ فائدہ کر دیا۔ میں شرم سے غرق نکل ہو رہا تھا۔ نہ صرف اعلیٰ فوج بلکہ قوم کی نیکی ہو رہی تھی اور یہاں دونوں کی آہو کا محافظ میں تھا کہ سب سے سینئر تھا لیکن یہی سینیارنی کا استعمال کس شکل میں کرتا؟

بکری پاشا کی داڑھی نوچ لینا؟

قاروق کوشت اب کھانا؟

صوبیدار صاحب کے منہ میں فوشین پن ڈال دینا؟

یا کبھی کوہیں قالن کر کے رائٹ لینٹ کرنا، جگہ سے باہر نکل آنا؟

ان میں سے کوئی حرکت بھی نہ کرنا تو صوبیدار صاحب سے بھی زیادہ ممتاز الونہما چنانچہ انتہائی بے بسی میں سر ہٹ کر بیٹھا کیا اور سنتا رہا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے سر پر کیا کیا ہوئے تھے اور کیا کیا نعرے لگے۔

آخر مجلس برخاست ہوئی۔ واپس ٹیپ میں پہنچے۔ صوبیدار صاحب کہ اب دربار خلیفہ سے نکل کر پونٹ لائن میں آگئے تھے، برخواستگی بلکہ قیدی تیار کر کے لگے۔ صوبیدار صاحب کا جرم واقعی سنگین تھا، لیکن اس سادہ اور جوشیلے مسلمان کا جیل خانے سے ایک ہفتہ اور باعزت معارف بھی تھا، یعنی محاذ جنگ۔ دوسرے روز دفتر میں بلایا تو صوبیدار صاحب سمجھے کہ اب کورٹ مارشل ہوتا ہے لیکن جب محاذ جنگ پر جانے کا حکم سنا تو ان کی آنکھوں میں روشنی کی وہی پرانی کرن پھوٹی۔ سیلوٹ کیا، دفتر سے باہر نکلے اور مع اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ ظاہر

قرب سے گزرے تو جیسے صوبیدار صاحب کا اندر سے ہنس دیا ہو۔ پھر دیوانہ وار اٹھے اور دایاں بازو بلند کر کے نعرو بکیر کی صدا لگائی اور ایک مرتبہ اور اللہ اکبر کی آواز گونجی۔ اب کے شاہ قاروق نے قہقہہ لگایا اور تمام حاضرین خصوصاً پاشاؤں نے شاہی قہقہے کی تائید میں اپنے جی حضور کی گنگے پھاڑ کر رکھ دیئے اور شامیانہ سر ہٹا دیا۔ ہر چند کہ اللہ اکبر کا نعرو ہمارا دین و ایمان تھا، تاہم اس مجلس میں اس نعرو بازی سے ہم قماش بن گئے۔ شاہ قاروق کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی، تو جلسے کے ختم بکری پاشا میرے پاس آئے اور نوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے مبارک باد دے کر کہنے لگے:

"تمہارے جوانوں کے قماشے سے جلالت الملک بہت خوش ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ حضور کی رخصت کے وقت بھی ایسا ہی کریں، تو حضور اور خوش ہوں گے۔"

گئے ہاتھوں مجھے یہ مزوہ بھی سنایا کہ تمہاری چائے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اب اگر میں بکری پاشا کو دل کی بات بتاتا تو کھٹک کر تم اور تمہارا بادشاہ بہشت کی دوسری طرف جاسکتے ہو، لیکن یہ کہنے کی بات نہ تھی۔ بکری پاشا کی سنائی اور قاروق بکری پاشا۔ صوبیدار صاحب بھی بکری پاشا کی سن رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ غلط وقت کی خوشنودی کا امکان ہو تو وہ دن بھر نعرے لگاتے رہیں گے۔ بہر حال جیسا کہ فوج کا انتظام ہے میں نے صوبیدار صاحب سے کہا:

"آپ نے عدول حکمی کی ہے۔ آپ اپنے کو زیر حراست سمجھیں۔"

صوبیدار صاحب کے چہرے کا رنگ ذرا پیکا ہونے لگا اور آپ نے میری طرف دیکھا بلکہ پہلی دفعہ محسوس کیا کہ یہ شخص بھی ساتھ آیا ہے اور غالباً اپنے دل میں وہی باتیں سوچتے لگے جو گرفتاری کے وقت لوگوں کے دماغ میں آتی ہیں، چنانچہ ایک لمحے کے لئے ان کے ذہن میں خلیفہ اللہ اور بکری پاشا کے درمیان سے ہمیں بھی ہار پائی ہوئی۔ لیکن اسے میں قاروق تقر کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے لمحے صوبیدار صاحب نے ہمیں دماغ سے نکال باہر کیا۔ ان کی آنکھوں میں پھر وہی روشنی عود کر آئی۔ ان کے نزدیک ہر مصری باتیں کرتے وقت قرآن پڑھنا معلوم ہوتا تھا اور اب تو امیر المؤمنین خود غن سناتے تھے۔ صوبیدار صاحب

تھا کہ یہ نعرہ امیر المومنین کی شان میں نہیں بلکہ "غریب الاقرین" یعنی اس خاکسار سیکند  
لفٹنٹ کے اعزاز میں ہے۔

### چند روز عباسیہ کیپ (قاہرہ) میں

میتا کیپ میں ہمیں صرف سات دن کے لئے ٹھہرایا گیا تھا، لیکن مہینہ پورا گزر گیا اور  
کسی نے ہم سے اتنا طے نہ کیا کہ سوال نہ کیا کہ منہ میں کے دانت ہیں۔ اور ہمیں خود کیا  
ضرورت تھی کہ وہ کہہ لیتے؟ ہمیں حوالہ دیا گیا کہ قاہرہ مولانا یاد تھا کہ قلعہ زبانی بتیں دانتوں  
میں کیسے رہا کرتی ہیں، یعنی کوٹ نہیں بدلتیں۔ ہم نے بھی زبان نہ ہلائی، کیونکہ ہمیں ہنر کی  
لما قات کی اتنی بے تابی نہ تھی، چنانچہ اس خدا داد فرصت کو نینیت جانا اور قاہرہ کا گھوگھٹ  
اٹھا کر ذرا تنسیب سے دیکھنا شروع کیا تا آنکہ خداوندان کیپ کو احساس ہوا کہ یہ شخص کسی  
قدور و کمال والا ہو چلا ہے، چنانچہ ہمیں فی الفور کیپ سے روانگی کا حکم ملا، لیکن حکم پر عادت  
ہمارا تیار نہ تھا، کی بجائے عباسیہ کیپ میں کر دیا گیا تھا جو قاہرہ کے دوسرے یعنی شمالی سرے پر  
واقع تھا۔

مجاز کی بجائے عباسیہ جانا ہمیں یوں معلوم ہوا جیسے عمر طبعی کے علاوہ کچھ فالتو زندگی  
عنایت ہو گئی ہے اور ہم نے طے کر لیا کہ ان جھوٹے کے ایام میں ہم قاہرہ کو حسب ضرورت  
تہہ بالا کریں گے، لیکن یہ خدا تعالیٰ اور لفٹنٹ کرنل پنیرسن کو منظور نہ تھا۔  
لفٹنٹ کرنل پنیرسن عباسیہ کیپ کے کمان افسر تھے۔ آپ کی سیرت کے کئی درخش  
پہلو تھے لیکن جس پہلو سے ہم ہاتھوں کا واسطہ تھا، یعنی آپ کا مزاج، وہ اتنا درخش نہ تھا جتنا

میں گالیاں دیتے ہوئے تیزی سے لپک رہے ہیں۔ یکپ کے سینکڑوں افسر اور سپاہی کام چھوڑ کر تماشا کرنے لگتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کوئی بدتمیز جوئے افسر جوئی حسین کے طور پر کرقل صاحب کے حق میں تالی بھی بجاتا ہے۔ اور ہر گاہے مالی کے چہرے پر ہراس ہے اور بیٹھانی پر بیٹھ۔ کرقل صاحب کی آنکھوں میں غضب ہے اور منہ پر بھاگ راہ میں ایک ٹینگ کھڑا ہے۔ مالی جان عزیز بچانے کی خاطر ٹینگ پر چڑھ جاتا ہے، لیکن پیچھے دیکھتا ہے تو کرقل صاحب بھی جوں توں کر کے ٹینگ پر چڑھ رہے ہیں۔ مالی بے خطر چھلانگ لگا کر زمین پر آ جاتا ہے۔ کرقل صاحب بھی اتنی ہی بے ساختہ چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ مالی کہ جو ان ہے، سنبھل کر اٹھتا ہے اور بھاگنے لگتا ہے لیکن کرقل صاحب کا یہ حال ہے کہ عشق کی ایک جست نے طے کر دیا تھا تمام۔ چھلانگ کے بعد ڈھیر بھج جاتے ہیں۔ مالی مڑ کر دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ آج کا تماشا ختم ہے۔ آرام سے اٹھنے قدم جا کر کھڑی میں غائی شروع کرتا ہے۔

بد قسمتی سے اس حادثے میں کرقل صاحب کے پاؤں میں چوٹ آگئی۔ دو دن ہسپتال میں رہے۔ پھر ہسپتال سے رہے اور صوبہ بھر ہمارا جینا حرام کر دیا۔ یعنی اور باتوں کے علاوہ ہمارے شہر جانے پر پابندی لگا دی۔ ہمارا انچور یہ تھا کہ مالی کی گرفتاری میں غیر جانب داری سے کیوں کام لیا؟

مہاسیہ یکپ آرمز کو دینی رسالے والوں کا یکپ تھا۔ فوج میں رسالے والے اپنے بائکین کے لئے چھوڑ دیں۔ تنگ پتلونیں اور لمبے کوٹ پہنتے ہیں، لمبے بال رکھتے ہیں اور لمبی ہاتھتے ہیں۔ دوسرے فوجیوں کو ایسی نزاکتوں کی اجازت نہیں لیکن رسالے والوں کے لئے یہ سب کچھ روا تھا جائز ہے اور ج تو یہ ہے کہ ان کے دم سے ہی فوج کی سناپ زندگی میں کچھ آب و رنگ ہے۔ میں کہ سٹیل کور کا ایک خاکی پوش تھا، ایسے ہی خوش وضع افسروں سے گھرا ہوا تھا۔ بے جی سنگھ، جوشی، حبیب اللہ محمد یعقوب، ارجن داس سنگھ اور بیٹا اگمریز افسر۔

لنٹنٹ بے جی سنگھ جان سناپ باتیں کرتے تھے، لیکن باتوں میں وہ لذت کہ جو اس نے کما۔ ہمارے دل میں لگا۔ جوشی بھی لینٹنٹ تھے۔ چھوٹے قد کی وجہ سے رسالے میں کسی قدر بے جا سے لگتے تھے، لیکن اپنی رنگین مزاحی سے وہ مہترضین کی توجہ قد کی طرف آنے ہی

آقل فضاں تھا۔ نتیجتاً ہمیں جرموں کے علاوہ اپنے کرقل صاحب سے بھی جنگ یا خانہ جنگی کا سامنا تھا۔ آپ اوجیز عمر اور درمیانے قد کے خورہ سے آدمی تھے۔ ملاقات پر اینڈائی کلمات میں ایسی شرافت و لطافت کا اظہار کرتے کہ آپ پر فرشتے ہونے کا گمان ہونے لگتا، لیکن جوں جوں گفتگو بڑھتی آپ صراطِ مستقیم سے بتدریج بھٹکتے لگتے اور اپنی لطافت میں عرق چرائیٹا مانتا شروع کر دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی شبہ نہ رہتا کہ آپ کو نئے فرشتے کے بروز ہیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو آپ کے دفتر میں گنگناٹے اور بچھڑاتے داخل ہوتے دیکھا۔ جن کے پیچھے سے ایک دو قہقے بھی سنائی دیے لیکن پھر کبھی گالیاں گونہیں، کبھی کے پٹے اور کبھی چھڑے۔ چونکہ کرقل صاحب مساوات کے قائل تھے، لہذا اس کلمے سے کوئی ملاقاتی مستثنیٰ نہ تھا۔

تیری سرکار میں پہنچے تو بھی ایک ہوئے

ایک دن یکپ کے ایڈجسٹمنٹ کیشن، سنگھ فکٹ شرف ملاقات حاصل کرنے کے بعد اٹکے تو ان کی آنکھ کے گرد ایک بے عیب آنسو ہلا تھا کرقل صاحب کے زور دست کا نتیجہ تھا۔ دوسرے دن سینڈ ان کمانڈر بجر ریٹ برآمد ہوئے تو ان کے کمرے میں روشنی کی ایک وسیع اور دلکش سی افشاں تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ ایک دوا کا خون باقی بھی کرقل صاحب کے سر ہے۔ غریب ہیڈ ٹھکر کے ماتھے پر تو ایک مشکل بخود ملی "روڈا" ابھرا رہتا تھا جس کی تازگی میں کوئی کمی نہ آئی تھی کہ کرقل صاحب مناسب وقتوں کے بعد اپنے پیوٹ سے اس کی تجدید کرتے رہتے تھے لیکن کرقل صاحب کا شاہکار وہ واقعہ تھا جو ایک دن انہیں یکپ کے مالی کے ساتھ پیش آیا۔

سات بج رہے تھے۔ تمام لوگ اپنے کاموں پر آرہے تھے۔ کرقل صاحب بھی ہاتھ میں چھڑی لئے دفتری سمت رواں تھے کہ اتفاقاً آپ کی نگاہ مالی پر پڑی جو پھولوں کی کیاری میں کام کر رہا تھا۔ حسب معمول آپ نے اسے بھی بے مقصد شرف گفتگو بخشا۔ پھر جیسا کہ دستور تھا گفتگو شاہوشوں سے گزر کر گالیوں سے ہوتی ہوئی ڈانڈوں تک آپنی اور مالی بھاگ لگا۔ خدا جانے کرقل صاحب کو کیا سوچا کہ مالی کا تعاقب شروع کر دیا اور ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ آگے آگے مالی عربی زبان میں فریاد کرتا ہوا بھاگ رہا ہے اور پیچھے پیچھے کرقل صاحب اگمریزی

میں داغ کا مصرع نکلتا۔

"جلا کے خاک نہ کروں تو داغ نام نہیں"

اس پر آپ فرماتے: "لوم بند اے" اے داگ وی سرگت پیندا اسی۔"

آپ نے کہیں سے سن لیا تھا کہ افسری شراب پئے بغیر ناکتہ نہیں ہوتی، چنانچہ سرشام اپنے کوارٹر کے باہر میز پر بوتل اور گلاس رکھ کر بیٹھ جاتے اور پینے سے پہلے ہی ایکی باتیں شروع کر دیتے جن سے ان کے خیال میں مستی کا اظہار ہوتا تھا مثلاً ہوا یا ہٹر کو مخاطب کر کے بڑی ذرا حق مکر عام فہم کہیاں کہتے۔ اب وہابی کہیاں دینگے تو انا اور دور رس تنیل کی آئینہ دار ہوتی ہیں، تاہم اہلانا سے مستی سے زیادہ زبردستی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ سے نوشی سے بھی رام ناتھ کی رام نامی کی ان کی کپتانی کا طمع ان کا جزو بدن نہ ہو سکا۔

یہ نہیں کہ ہر وہ آدمی جو ریکٹ سے ترقی پا کر افسر بنا، رام ناتھ تھا۔ جی نہیں، بے شمار افسر ایسے تھے جو سپاہی بھرتی ہوئے اور بعد میں افسری خود ان کے استقبال کو آئی۔ وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے تھے کہ انہوں نے بطور سپاہی ابتدا کی۔ بلکہ بھی ذکر کرتے تو ان کے سپاہی رہنے پر رشک آتا، لیکن عام طور پر یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے جوانی میں ہی افسر کی منزل عبور کر لی تھی۔ رام ناتھ بہت بڑے طوطے تھے اور اس عمر میں میاں مٹھو سے زیادہ پیچیدہ بات کرتا ان کے پس کی بات نہ تھی۔

کہ عجمی پیرسن کی تنگ مزاجی کی وجہ سے عباسیہ کیمپ کی زندگی کافی بھینکی تھی۔ اچانک جرمنوں کو ہم پر رحم آیا اور انہوں نے ہمارے لئے رونق کا سالن پیدا کر دیا یعنی ایک رات عباسیہ کے نواح میں ہوائی جہازوں سے فی البدیہہ دس بارہ بم پھینک دیئے۔ اس خیال سے کہ شاید جرمن اپنی چھات فوج قاہرہ کے ہوائی اڈے المذا پر اتارنا چاہتے ہیں، "میں راتوں رات المذا کی حفاظت کے لئے باہر جانے کا حکم ملا۔ حکم دینے والوں کے حق میں کلمہ خیر سے مختلف کلمہ پڑھتے ہوئے بستر سے اٹھے۔ وردی پٹنی اور سارا کیمپ پیش آرڈر میں المذا کی طرف بڑھا اور ایرڈروم کے گرد خندقیں کھود کر مورچہ گیر ہو گیا۔

رات گزر گئی، لیکن جرمن ہوائی جہاز نہ لوئے، ہر حال ہمیں بتایا گیا کہ جرمنوں کا انتھار

نہ دیتے تھے۔ جوشی کی یاد اس غزل سے وابستہ رہے گی جو خورشید نے ایک نہایت ہی دلربا لے میں گائی ہے اور جس کا مضمون ہم پریسوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ پہلا مصرع تھا:

"جو ہم پہ گزرتی ہے ستاروں سے پوچھنے"

جوشی ہر شب یہ ریکارڈ لگاتے اور جب ختم ہو چکا تو اپنی پوٹائیں رہنے والی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ خدا جانے سالی ستاروں سے سوال بھی کرتی ہے یا نہیں؟

کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی!

کیپٹن حبیب اللہ بیل (Buhle) کہلاتے تھے۔ ہم سے سینئر تھے اور وہ ذاتی فاطمے پر رہتے تھے۔ خاصے انگریز مزاج تھے، لیکن رمضان میں دن بھر کی فوجی مشقت کے باوجود روزے رکھتے تھے۔ اگرچہ داس تنگ اور بیوقوف، بالکل ہی طرح سیکھ نہ لیتے تھے۔ ہمارے ہم نوالہ وہم بیالہ تھے اور انہی نوالوں اور بیالوں کی خاطر ہم ہر شب کرنل صاحب سے آنکھ پچاکر گراہی یا دیہ میں جانتے تھے۔

لیکن ان سب میں سے دلچسپ آدمی کیپٹن بیل تھے۔ ابتدا سے جنگ میں رہا، سالہا تھے اور اگر جنگ نہ چھڑتی تو شاید رسالہ داری چھتے اور مرتے، لیکن جنگ کے فیض عام میں خانہ براندازان فوج نے آپ پر بھی کپتانی پھینک دی، اور بچ تو یہ ہے کہ ایسا کر کے آپ کا ستیا ناس کر دیا۔ یعنی ایک عظیم الشان رسالہ دار کو ایک نہایت بے وقعتیے افسر میں بدل دیا۔

رام ناتھ اپنے سرٹیکٹوں کے علاوہ فعل و صورت سے بھی خفا ہو جاتے تھے۔ آپ کا کپتان ہونا نہ صرف آپ کے مزاج کے منافی تھا بلکہ غالباً قضا و قدر کے ابتداء کی منصوبے کے بھی خلاف تھا۔ آپ کسی کام میں بھی کپتانی کرتے تو آپ سے حوالہ داری ہو جاتی۔ پریڈ پر جاتے تو سپاہیوں پر دانت پینا شروع کر دیتے۔ وردی پٹنے تو سراور ٹوپی میں تسلی بخش ربط نہ پیدا ہو سکتا۔ چائے پیتے تو ہونٹوں سے نہیں بلکہ مہمیزوں کے زور سے۔ پیالی ہونٹوں کے قریب جاتی، تو پھر پھڑانے لگتی اور خرا کی سی آوازیں آنے لگتیں۔ الغرض آپ چائے اسی اصول پر پیتے جس پر جیٹ طیارے پرواز کرتے ہیں۔ سگریٹ پیتے تو پہلے اسے منہ میں بھینچتے اور پھر آنکھیں بند کر کے کش لگاتے اور آنکھیں کھولنے تک اسے راکھ کر دیتے۔ یہ دیکھ کر



جاری رہے گا۔ رات تو کسی نہ کسی طرح تارے گمن کر گزار دی "لیکن دن بھر کا انتظار بڑا گراں گزارا۔ جرمینوں کو اتنا تھانہ آئے "لیکن انتظار بخت بھر جاری رہا۔ وہ عربی کماوت ہے کہ انتظار موت سے بھی اشد ہوتا ہے۔ موت کا تو ہمیں پانفل تجربہ نہ تھا "لیکن مزید انتظار سے بچنے کے لئے ہم اس تجربہ پر بھی تیار تھے "چنانچہ اسی ہفتے کسی وقت اگر جرمین آجاتے تو ہم بے حد ممنون ہو کر ان سے لڑتے اور مرتے۔

آخر سات دن کے بعد کسی کو رحم کیا اور ہمیں حکم ملا کہ رات اپنے کو ارنوں میں سو سکتے ہو لیکن صرف آدھ گھنٹے کے نوٹس پر۔ گویا وردی پن کری بستر دروازہ ہوتا تھا۔ ہمیں اتنی رعایت بھی نصیب تھی۔ ہمارے اکثر ساتھی جج وردی میں ہی سو جاتے "لیکن ہم نے ریشمی پاجامہ زیب تن کیا۔ نماز پڑھی اور ایک مٹی نیند کی لبتہ کی۔ لیکن کربا خدا کا بلکہ جرمینوں کا کیا ہوا کہ اسی رات المذا پر پھر ہوائی حملہ ہوا۔ فی الفور الارم ہوا اور آدھ گھنٹے میں ہم پھر مورچوں میں تھے۔ یہ مورچوں میں بیٹھنا بھی ناقص ہواشت تھا لیکن الارم سن کر بیدار ہونا "بستر سے جدا ہونا "ریشمی پاجامے کی جگہ خاکی وردی اور جوارچہ پہنا کر میں ہسٹل لگاؤ اور سر پر آہنی خود رکھنا۔ سراسر ظلم تھا "ہو بیٹا جی۔

اوجھل مصریہ سمجھے کہ انگریز کے دن گنتی گنتی ہیں۔ دائیں بائیں دیکھ کر "استغیل یا رسول" کا نعرہ لگانے لگے۔ انگریزوں نے قاہرہ کے بازاروں میں چار ہاروڈ بلاک لگائے کہ روٹل یا اس کے متوسلین اوجھل آئی نکلیں تو ان پر انگریزوں کی نارضا مندی کا شعلہ بھجوا جائے۔ جب اہل مصر کو ذرا تیزی سے آزادی کے خواب آئے گئے "تو انگریز اس لذت خواب میں کسی قدر بدتمیزی سے غل ہوئے۔ پانچ چار ٹینک شاہ فاروق کے العابدین محل کے ارد گرد کھڑے کر دیے اور شاہ موصوف کو ایک طشتری میں قلم رکھ کر ایک لکیر پر دستخط کرنے کی ذمت دی۔ شاہ نے نیچے ٹینک دیکھے اور اوپر جرمین طیارے غائب پائے تو دستخط کر دیے اور بیک جنبش قلم ایک حقیر سے کانڈ کو تاریخ میں ایک ناچیز سے قلم کو برٹش میوزیم میں جگہ دے دی۔ پھر انگریز کمانڈر سے ہاتھ ملایا۔ اسے دسکی پیش کی اور اپنے وزیر اعظم علی ماہر پاشا کو الوداع کی۔ انگریزوں نے اپنی پند کا وزیر فاروق کو پیش کیا اور اتفاق کی بات کہ فاروق کو نیا

وزیر اعظم انگریزوں سے بھی زیادہ پسند آیا!!

تائب لائے ہی بنے کی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

آخر جرنل ماٹکری العالمین پیچھے اور جرمینوں کی توجہ اوجھل گئی۔ قاہرہ میں انگریز پھر سراٹھا کر چلنے لگے اور ہمارا کیپ نے سرے سے اپنے کرمل صاحب کی کرم فرمائی کے لئے محفوظ ہو گیا۔ اس کرم سے تھوڑا سا حصہ اس خاکسار کو بھی ملا اور وہ یوں کہ ایک جیب میں بیٹھا ہوائی اڈے کو جا رہا تھا کہ کیپ کے دروازے پر کرمل صاحب مل گئے۔ میں نے حسب معمول سیدھے کیا تو کرمل صاحب نے کمال بندہ پروری نہ صرف سلام کا جواب دیا "بلکہ جیب کو ٹھہرا کر مجھے "ہیلو ٹھہرا "بھی کہا اور پوچھا:

"کہاں جا رہے ہو خان؟"

عرض کیا: ہوائی جہاز سے خاص ڈاک آ رہی ہے۔ اسے لینے جا رہا ہوں۔"

مسکرا کر بولے: "شاہاش جہاز اس وقت آتا ہے؟"

عرض کیا: نامس بجے۔"

بولے: "نہیں گیارہ بجے۔"

میں نے ادب سے کہا: "شاید آپ کو یاد نہ ہو دس بجے ہی آتا ہے۔"

اس کے بعد وہی ہوا جو شدنی تھا۔ کرمل صاحب نے جوش میں آ کر اپنی ٹوپی زمین پر دے

باری اور جیب کو اپنی چٹری سے ضرب لگا کر بولے:

"دس نہیں گیارہ بجے آتا ہے۔"

ظاہر تھا کہ اب شعلے بلند ہوں گے لیکن پیشتر اس کے کہ مالی والی تاریخ دہرائی جاتی ڈرائیور نے زبان نکال کر کرمل صاحب کا منہ چڑایا "ایکسلٹر کو دیا اور جیب فرار سے بھرتے ہوئے نکل گئی۔ جواب میں کرمل صاحب نے ہم پر تو دانت پیسے "لیکن ڈرائیور کی بدتمیزی پر ہنس دیے اور انہیں ہنسنایا چاہئے تھا کیونکہ ہمارا ڈرائیور کوئی سپاہی لٹا سکتا نہ تھا بلکہ نہایت ہی شوخ و شگ اسے فی ایس لڑکی مس مار کر تھی اور کرمل صاحب ہر چند کہ سر کے کھوکھلے تھے "سینے میں دل رکھتے تھے۔

ہمارے سنے تقرر اور کپتانی کا حکم آیا۔ بنگو نے کرل پیئرس سے بلا بلا ہمیں سوڈنٹ آرڈر دے دیا۔ مارگرٹ بھی ہماری سازش میں شریک ہو گئی۔ چپکے سے چپ لے آئی۔ ہمیں اور ہمارے اسباب کو لاڈر معاوی پانچا دیا۔ مارگرٹ کو الوداع کی تو کسی قدر رنج سا ہوا، لیکن دوسرے روز جب معاوی کی کھلی فضا میں سانس لیا تو ہماری دنیا لاکھوں مارگرٹوں کے جسم سے معمور ہو گئی۔

جب کندھوں پر کپتانی لگائی اور کپٹن اوڈاسٹھ سے انڈین ونگ کی کمان سنبھالی تو ہمیں معجزہ جل ٹھکری کا خیال آیا کہ انہیں بھی پچھلے دنوں ہی آنھوں فوج کی کمان دے کر عالمین بھیجا گیا تھا۔ یعنی زمہ داریاں کچھ ایک جیسی ہی تھیں۔ ذرا سادہ سہ کا فرق تھا۔ بڑی پھرتی سے اپنے دوستوں کو دلہن میں خط لکھے جن کا مدعا فقط یہ تھا کہ اب ہم محض نیم نشین نہیں بلکہ ہمارے کندھوں پر تین تین پھول کھل اٹھے ہیں۔ بارہائی میں اپنے شانوں کو دیکھا۔ ستاروں کی کثرت سے ککشاں نظر آتے تھے۔ حتیٰ کہ آنکھوں میں ہکا چوندی آنے لگی اور گردن میں ہلکے سے جھنجھکاؤ۔

اب تو باقاعدہ اپنا پونٹ تھا اور نیم آفسر کمانڈنگ۔ گویا سیال کے محتاج نہ تھے خود کو تو ال تھے سوڈر کس کا؟ بلکہ توڑی سی ہے قائد کی کر کے بھی دیکھ لی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ یہاں کسی پیئرس کا خوف نہ تھا۔ پھر جاتے سینکڑوں بازو سلیوٹ میں اٹھ جاتے۔ محسوس ہوتا کہ دیکھنے والے ریشہ کر رہے ہیں چنانچہ ہم دل ہی دل میں ہر سلیوٹ کرنے والے کو دعا بھی دیتے کہ غصہ نہ کرے۔ کہیں تیرے دست و بازو کو۔ پھر آرڈر لی روم ہوتا یعنی ماتحتوں کی نکالیاں اور فرادیں سننے کے لئے دربار لگتا۔ پھر سرکاری ڈاک دیکھتے اور جی چاہتا تو کوئی خط پڑھ بھی لیتے۔ پھر فیلی فون پر لوگوں سے ضروری اور غیر ضروری باتیں ملا جلا کر کرتے۔ ہمیں یقین تھا کہ افسری میں کچھ مزا ہے تو لوٹ رہے ہیں۔ یہ لوٹ کوئی ہنہ بھر جاری رہی تا آنکہ اچانک بنگو کا عباسیہ سے فون آیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا:

"نفس ہو گیا۔ کرل پیئرس کو تمہارے جانے کا پتہ چل گیا ہے، سخت برہم ہے۔ جو اندر جاتا ہے اسے بیرونی سمجھ مارتا ہے۔ تمہارے متعلق جی ایچ کیو کو کچھ رہا ہے کہ کپتانی

بہر حال ہمارا قصور معاف ہونے والا نہ تھا اور نہ ہی ہم مستقل طور پر مارگرٹ کی حفاظت میں رہ سکتے تھے چنانچہ ہم آنے والے طوفان کے انتظار میں بیٹھ گئے مگر دوسرے ہی روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہماری زندگی میں تو ایک انقلاب سا برپا کر دیا، لیکن کرل صاحب نے بھی اس میں حصہ لے لیا اور بتل لاہوریاں: "بدوبدی"

واقعہ یہ ہوا کہ قاہرہ کے مشرقی مضافات میں جنہیں "العادی" کہتے ہیں راتیں سٹیل کور کا ایک بست پڑا کیپ اور سکول تھا۔ اسی سکول کے انڈین ونگ کے افسر کمانڈنگ کپٹن اوڈاسٹھ تھے۔ اتفاق سے ان کی وطن کو واپسی کا وقت قریب آیا اور جی ایچ کیو مکمل ایسٹ (قاہرہ) کو ان کے جانفیں کی حاجت محسوس ہوئی۔ اسی تلاش میں عباسیہ کیپ سے فون پر پوچھا گیا کہ اگر سٹیل کور کا کوئی موزوں سا افسر ہو تو اس کا نام پتہ بتاؤ۔ فون لینے والے کیپ کے ایڈجسٹ کپٹن بنگو تھے اور ہمارے پار تھے۔ جواب میں بولے:

"بڑا موزوں آدمی ہے لیکن بے ذرا سینکڑہٹ ہے۔ کوئی دیر نہ ہو کہ اسے سروس کی فکر اور جی ایچ کیو کے فون پر کوئی حاتم طائی بھیج دیا۔ بولا: "اگر موزوں ہے تو سروس کی فکر مت کرو۔ ہم کپتانی دیں گے لیکن اس سے کوئی معاوی یا کر سٹیل سکول کے کرل سے اپنی موزونیت کی تصدیق کرا لائے۔ اگر کرل صاحب نے ہاں کہی تو ہم کل اس کے تقرر کا حکم بھیج دیں گے۔"

بنگو نے یہ سنا تو بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور چٹھی دے کر ہمیں معاوی کی چپ کے مکان افسر کرل جو روڈین کے پاس بھیج دیا۔ بنگو اور ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ معاملہ کرل پیئرس سے پوشیدہ رکھا جائے گا۔ ورنہ ہماری کپتانی کے بن کھلی مریحہ جانے کا اندیشہ تھا۔ معاوی میں کرل جو روڈین سے ملاقات ہوئی تو بڑے شفیق سے بزرگ لگے۔ اس بات سے خاص طور پر متاثر ہوئے کہ سٹیل کور کا ایک افسر سالے کے کیپ میں شائع ہو رہا ہے۔ بولے:

"حکم ملے ہی یہاں آجاؤ۔"

ظاہر تھا کہ کرل صاحب کی نگاہ میں ہم موزوں ہیں چنانچہ دوسرے روز جی ایچ کیو

سنائے چند دن بعد جب کرقل پیٹرن کو مئی۔ ایچ۔ کیو سے جواب گیا تو موصوف نے اپنا  
بیٹ اتار کر ٹخنے کی بجائے کھالیا! ہڑپ کر کے نہیں "لقہ لقمہ! واللہ اعلم بالصواب۔"

کے قابل نہیں۔ اسے مزید تجربہ حاصل کرنے کے لئے فی الفور محاذ جنگ پر بھیجا جائے۔ اب  
تم جلد ہی مئی ایچ کیو سے من لو گے۔ ساری اولاد برائے۔"

یعنی ہماری حالت کچھ فیض سے ملتی جلتی تھی۔

جو کوئے یار سے نکلے تو سوائے دار چلے

ایک لمبے کے لئے ہمارے کندھوں کی ککشاں مع کیتانی کے مانند پڑ گئی اور ہمارے تصور  
میں سیدی رزخ "جرمن گولے اور ملی بیٹ آنہودار ہوئے۔"

آتے ہیں فیض سے یہ مضامین خیال میں

قریب تھا کہ ہم لا کھڑا جائیں لیکن ایک بزرگ کا قول یاد آیا کہ اگر مصیبت آجائے تو  
اس شخص کا خیال کہو جو تم سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہو۔ اس شخص میں موزوں ترین شخص  
نظام سدی تھا جس نے فقط آٹھ پہری سرور آرائی کے بعد آرام سے منگ اٹھا کر چمڑ کا  
شروع کر دیا تھا اور ہم تو خیر سے متواتر آٹھ دن سے کھانا تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا اور ذرا کانپتی  
کانپتی کیتانی بھی بدستور جاری رکھی لیکن حسب توقع وہ سب من کرقل جو موزوں کا اردو نظام  
لے کر آیا۔ ان کے دفتر میں گیا تو کرقل صاحب نے ایک کاتھ ہماری طرف بڑھایا۔ یہ مئی ایچ  
کیو کا خط تھا۔ پڑھا تو وہی کچھ لکھا تھا جو ہنگو نے بتایا تھا۔ رکتے رکتے پوچھا:  
"مجھے کب محاذ پر جانا ہے؟"

کرقل جو ڈین میرے سوال پر مسکرائے اور ایک دوسرا کاتھ میری طرف سرکایا۔ یہ مئی  
ایچ کیو کو ان کی طرف سے جواب جا رہا تھا۔ لکھا تھا:

"یہ افسر میرے ماتحت کام کرتا ہے۔ کیتانی کے لئے موزوں ہے یا نہیں اس کا فیصلہ مجھ  
پر ہے اور وہ یہ ہے کہ موزوں ہے۔ عبادت یکپ کے کرقل صاحب کو میری طرف سے بعد از  
آواب بتایا جائے کہ دوسرے یونٹ کے افسروں پر رائے زنی کرنا فوج کا دستور نہیں۔"

ہمارے دماغ سے سیدی رزخ "جرمن گولے اور ملی بیٹ یک قلم غائب ہو گئے اور  
واپس انڈین ونگ میں جا کر ہم نہایت شان و شدت سے کیتانی کرنے لگے جو نظام ستے کی سرور  
آرائی سے کہیں زیادہ کھری اور دیر پا تھی۔

## مڈل ایسٹ سنگل سکول معادی (قاہرہ) میں

صحرائی لڑائی اور عباسیہ کی "مارنگل" کے بعد معادی کی زندگی ایک خواب کی طرح سناٹا بن گئی تھی۔ صبح سے دوپہر تک و تک کامیابیوں تو شاید ایسا سبک محسوس نہ ہوتا لیکن خود اپنا پاس ہونے کی وجہ سے ایک دلولہ انگیز تقریب بن گیا اور دوپہر کے بعد تو بس ہم تھے اور قاہرہ۔ معادی کے اسٹیشن سے ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک ملک ڈریل ترین چلتی جو دس منٹ میں قاہرہ کے مرکز یعنی باب لوق اسٹیشن پر پہنچا دیتی اور پھر ہم قاہرہ کی دسمتوں میں کھو جاتے۔

قاہرہ کو روڈی اس اعتبار سے دو آتش ہو گئی تھی کہ نشیٹ لپا سی۔ ورنہ جو موسمی ہمارے ہم جماعت تھے، اچانک ایک دن معادی میں آنے وارہ ہوئے۔ یہ بھی سنگل افسر تھے اور محاذ پر ایک بریگیڈ کے ساتھ تھے لیکن ہندوستان کی آزادی کے ذرا اوپنی آواز سے حافی تھے جو ان کے انگریز کمانڈر کو موافق نہ تھا، چنانچہ انہیں میدان جنگ میں خطرناک سمجھ کر واپس کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ایسا کر کے بریگیڈر صاحب نے بڑا کار ثواب کیا کہ میں معادی میں ہر چند کہ خوش تھا، تنہا کسی افسر تھا اور ورنہ زیادہ انجمن آرا رفیق ملنا مشکل تھا۔ ورنہ کسی قدر زیر عتاب تھا، لہذا اسے کوئی سرکاری کام نہیں دیا گیا تھا۔ اس کا واحد شغل ہر شام قاہرہ کے کسی مقام پر انجمن آرا سے کرنا تھا۔ کبھی باویہ یا گرانی میں، کبھی شیشہ یا کانٹی نینٹل ہوٹل



کچالی۔ ایک جگہ ابتدا کی اور پھر وہیں انتہا کر دی یعنی شادی کر لی۔ ہم دید کی شادی میں شریک ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ قاہرہ کی زناہ کلب کا جزو بدن بن گئے۔

بات یہ تھی کہ ہماری بھالی لالی جو ایک معزز قبلی خاندان کی بیٹی تھیں، خواتین کلب قاہرہ کی سیکرٹری تھیں۔ یہ کلب کال پاشا چوک میں ایک وسیع عمارت میں واقع تھیں۔ قاہرہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی بیشتر خواتین اس کی ممبر تھیں۔ ہم دید کے شہ پالے تھے اور سکتر کے دیور، کڈا ایلانڈ آتے جاتے تھے۔ بھالی لالی کی بیسیوں سیلیوں سے بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ان میں عیسائی بھی تھیں اور مسلمان بھی۔ سب معزز گھرانوں سے تھیں اور ایک سے ایک خوش وضع اور خوش پوش۔ کڈا ایلانڈ کو اور مجھے کڈا لگا رہتا تھا کہ درما کوئی گل نہ کھلائے۔ اسیطافاً ہم نے درما کو قسم کھلائی جو اس نے پکا کھائے بغیر کھالی، لیکن درما کا اپنا دل پابند قسم سی، حسین و جمیل روزی کے دل پر تو کسی کو اختیار نہ تھا، چنانچہ ایک دن روزی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بحث بکلو سے دل نکال کر درما کے ہاتھ پر رکھ دیا اور جذبات سے مجبور ہو کر اسے بھری مجلس میں کھڑا کر دیا۔

"مجھے تم سے محبت ہے اور سخت محبت ہے۔"

ہم نے مذاق میں اڑانے کی کوشش کی تو روزی نے اپنا دامن اشکوں سے بھر لیا۔ ہم نے بھالی لالی سے رجوع کیا تو روزی کا علاج یہ طے پایا کہ درما "یکے از مشوقات" کو روزی کے سامنے اٹھائی جائیں کرے تاکہ روزی درما کو دل سے باہر نکال مارے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ ٹونا کامیاب ثابت ہوا اور روزی تیزی سے رو بہ صحت ہونے لگی۔

خواتین کی کلب نے ہمیں قاہرہ کے کئی اونچے گھرانوں سے متعارف کرایا۔ ہمیں خصوصاً مصری پاشا کا گھر بھی نہ بھولے گا جن کے خوبصورت ولاد واقع بلایا پوس میں جانے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا۔ ان کی دو بیٹیاں حسن و عفت کی تصویریں تھیں۔ ہمیں ماننا پڑا کہ ہر چند کہ نچلے طبقے کے اطلاق جنگ کی نذر ہو گئے تھے، اکثر اعلیٰ گھرانوں میں وہی پرانی قدریں تھیں۔ ان کی ہونہر بیٹیاں طرہ دار بھی تھیں اور دمندار بھی۔ ان کی ہم نشینی سے ایمان میں گرا بڑی بجائے تاؤ کی آتی تھی۔ ان میں سے اکثر کالوں میں پڑھی تھیں۔ ہم سے گفتگو کرنا کر مبحث

میں، کبھی انڈین کلب یا جزیرہ کلب میں اور کبھی انکل "من" کے یہاں یا بھالی لالی کے کلب میں۔ ان انہی ناموں سے تعارف ابھی تھوڑی دیر میں ہو گا۔

درما کم بخت نہایت خوش شکل اور گفتہ مزاج لہو جوان تھا۔ کھارک گھیل سے خطرناک حد تک مشابہت رکھتا تھا۔ کچھ خداداد اور باقی اس کی اپنی پیدا کردہ، یعنی وہ چلی بسی لکیری موچھ اور وہ نیم بہ معاشانہ سی ہنسی جس میں ہونٹ کم اور آنکھیں زیادہ مسکراتی ہیں۔ درما کی آنکھوں میں ایک شرر اور دلکش سی چمک تھی۔ وہ جہاں سے گزر جاتا، عورتیں دو بار دو کھینچے بغیر نہ رہ سکتیں۔

ایک روز گراہی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایک غارتوں کے دھماکے سے کچی کچی آئی اور درما سے کہنے لگی:

"تم کھارک گھیل ہو؟"

درما تعجباً اٹھ کھڑا ہوا اور وہی چشم و لب کی مسکراہٹ کا خدو بکھڑا کر لیا:

"اس کے متعلق تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن جو کچھ چہرے عین سے کہہ سکتا ہوں، یہ ہے کہ آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔"

ساتھ ہی درما نے خاتون کے لئے اپنی کرسی خالی کر دی۔ محترمہ بیٹھ گئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے درما کو دیکھ کر ان کی مرادیں پوری ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بھاری چار دن سے درما سے کلام کرنے کی تمنا میں پکرائی پھرتی رہی ہیں اور ارادے پابند حق اور توفیق بھی ہیں اور آج کشتی خدا پر چھوڑ کر منہ ہمارے اتر آئی ہیں۔ درما نے انہیں اپنی خوش کھالی سے کنارے پر لا کھڑا کیا اور دعا دینی رخصت ہو گئیں۔۔۔ درما کی زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے اور اس نے بیسیوں لڑکیوں سے اپنی غلامی کے بیان پابندھے، لیکن اپنی ہر جاتی محبت کا پول نہ کھلنے دیا۔ سوائے ایک باؤک موقع کے جس کا ذکر آنے والا ہے۔

ان دنوں قاہرہ میں ویسی افسروں خصوصاً ڈاکٹروں کی خاصی تعداد تھی۔ ان میں سے ایک بھروید پر کاش تھے۔ وہ، درما کی ضد تھے۔ سپاٹ چہرہ جو کسی ایکٹر سے مشابہ نہ تھا۔ موچھ سیدھی سادی شریفانہ بلکہ کسی قدر لالایا نہ یعنی کونوں پر مائل پستی۔ رہا عشق، تو بے حد

ہم تینوں کو اپنے دونوں ہانڈوں کی پیٹ میں لے لیا اور اندر لے چلے۔ ایک گیلری سے گزرے جس کے سرے پر دروازہ تھا۔ انکل نے دروازہ کھولا تو ہمیں کمرہ اور اس کی آرائش نظر آئی۔

قاری محترم ذرا پوچھیں کہ ہم نے اپنے نیک بچا کے ڈرائنگ روم میں کیا دیکھا۔ جائے نماز؟ صبح؟ کیا انہوں نے دیواروں پر اسلامی قطععات لگا رکھے تھے کہ روزِ محشر کہ جاں گداز ہو۔ اولیں پر سٹن نماز ہو؟ یا وہاں الماریاں دھری تھیں جن میں علم و حکمت کے موتی یعنی ہمارے آباء کی کتابیں رکھی تھیں؟ جی نہیں۔ اس کمرے کا نقشہ کسی قدر مختلف تھا۔ سارے فرش پر دیواروں تک ایرانی قالین پھیلا ہوا تھا اور کمرے کے عین وسط میں ایک براق چاندنی چھٹی تھی جس کے گرد چھوٹے رکھے تھے اور مرکز میں بلور کی کٹلے منہ کی صراحی پڑی تھی جس میں چار نرم و نازک ہاتھ ایک بائیں کر رہے تھے۔ یہ مائع ریز اور جنجری بوکوں سے نکل کر شیشی میں تبدیل ہو رہا تھا اور انڈیلنے والے ہاتھ چار حسین لڑکیوں کے تھے جن کے چہروں پر دھیمہ تھا لیکن بدن پر کچھ نہ تھا۔ مہمانوں کو دیکھ کر تعجباً انھیں۔ اہاؤ سلا کما۔ بالادب ایک ایک مہمان کا ہاتھ تھام کر اسے گلاب دیکھنے کے ساتھ بٹھایا یا لٹایا اور پھر صراحی سے لباب جام بھر کر پیش کیا۔

اس اثناء میں میری برخورداری زمین کی صورت پھوٹ پھوٹ کر برہنہ تھی۔ معامیری نگاہ انکل پر پڑی لیکن اب وہ مہمانوں سے غافل ہو چکے تھے اور اپنے ساتھی سے جام پر جام طلب کے جارہے تھے۔ انکل کوئی پچاس بچپن کے پٹے میں تھے۔ ایک جرمہ پیتے اور شعر دہراتے:

گرچہ جرم تو شے نیک در آغو خم گیر  
تا بحر گاہ زکنار تو جواں برخیزم

میں نے اپنے نیک انکل کو سرگرم مغل دیکھا تو میرا لبیدہ اور تیز ہو گیا۔ میں نے "اپنی" دشمن ایمان و آگہی کے کان میں کہا کہ اگر ہو سکے تو مجھے تھوڑا سا لبین سکواش پلا دو۔ ورنہ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ لیکن عمر خیام کے گھر میں لبین سکواش کا کیا کام؟ جب

کرتیں اور اپنی ملائم سی انگریزی میں (جس میں مثبت مثبت ہو جاتا ہے) بے حد بھاتیں لیکن ان کے سامنے ورنہ تک دم نہ مارتا۔

ایک دن لاہور سے ہمیں اپنے ایک بزرگ نے خط میں لکھا کہ میرے ایک بھری دوست "بجر" من "قاہرہ میں جنرل ہیڈ کوارٹر میں کام کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ بھی ہمارے بچا ہیں۔ جس قدر جلد ہو سکے ان سے ملو اور پھر ملنے رہا کرو کہ بہت نیک آدمی ہیں۔ اب بہت نیک آدمیوں سے گولی کی سی تیزی سے جاملنا گستاخی ہوتی ہے "لہذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دیر کر دی تو اگلے خط میں لاہور سے ڈانٹ آئی کہ بچا جان سے ملنے میں تاہل کیوں؟ وطن میں تو تم خاصے سعادت مند بنے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قاہرہ میں تمہاری صحبت کچھ ٹھیک نہیں۔ بچا جان سے بلا توقف ملو۔

ورنہ سے ذکر کیا تو بولا: "ٹھیک ہے۔ پچھلے چار بچا جان کے پاس جانا اور ان کے ساتھ شام کی نماز پڑھ کر گراہی آجانا۔" میں نے کہا: "وہ شاید تجھ کے لئے بھی ٹھیک ہیں۔ چلو اسے چلے ہیں۔ ہمارے بہانے رخصت جلد مل جائے گی۔"

ہمارے ایک دوست بجزلال افتخار سے انکل "من" کو پہچانتے تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر انہیں بھی ساتھ لے لیا۔ چلنے سے پہلے بچا جان کو فون کر دیا کہ مجھے ساتھ دو دوست بھی ہوں گے۔

انکل "من" نے قاہرہ کے ایک مہمان صے میں پانچویں منزل پر قلیت لے رکھا تھا۔ ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر ہو گئی اور کوئی رات کے آٹھ بجے سیزمیاں چڑھنے چڑھنے ان کے دروازے پر جاد تک دی۔ ایک وقفے کے بعد دروازہ کھلا۔ ہمارے سامنے ایک اوجیز عمر کا آدمی ملل کے کرتے اور ریشمی لنگی میں لمبوس کھڑا تھا۔ پاؤں میں پٹھو باری زری جو تا اور سر سے نکلا۔

بجزلال آہستہ سے بولے: "یہی انکل "من" ہیں۔"

میں نے برخوردار اندازے میں اپنا اور دوستوں کا تعارف کرایا۔ جواب میں انکل نے

خیمے کی تلاشی بھی لی جاتی۔

کرنل صاحب کے دفتر سے نکلا تو اپنے دنگ تک آتے آتے تجویز میں رہا تا اور ڈھاتا رہا۔  
ہسپتال کو نکال کر باہر رست میں دفن کردوں؟ نہیں کوئی دیکھ لے گا۔

نزدیک کے کنوئیں میں پیسٹک دوں؟ نہیں کوئی سن لے گا۔

اپنے دفتر میں الماری کے نیچے رکھ دوں؟ نہیں کوئی سو گھ لے گا۔

ہسپتال بالکل چھوٹا سا تھا، لیکن اگر سوئی کے برابر بھی ہوتا تو اضطراب میں اس کے قتل  
بخش چھوڑ دینا تو ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ ہر حال سیدھا خیمے میں پہنچا۔ ہسپتال نکالا۔  
سلیمانی ٹوپی کی نیچے بناہ ضرورت محسوس کی کہ ہسپتال کو پناہ کر سانسے میز پر رکھ دوں اور کوئی  
دیکھ نہ پائے۔ شناختی پر یہ تلاشت قریب تھا اور کچھ نہ سوچی تو ہسپتال کو اپنی عمر کی جیب میں  
ڈال لیا اور شناخت کے لئے چل پڑا۔

دنگ کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی تین قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور اسے میں کرنل صاحب  
میں شناخت کنندہ حسینہ کے کھڑے ہوئے۔ ہم بحیثیت او۔ سی ان کے استقبال کو ذرا  
تک کے پردے اور حائل کیا کہ ہم ہر قسم کی لیکن ہندوستانی ہیں اور کسی نہ کسی زاویے سے  
قاتل سے ضرور مشابہ ہوں گے۔ ناک اور کان بالعموم ہر ہندوستانی کے ایک ہی سانچے کے  
ہوتے ہیں اور ہم ہی پہلے ہندوستانی ہیں جن پر اس نیک بخت کی نگاہ پڑے گی۔ اگر اس نے  
کہہ دیا کہ قاتل ہے تو کتنا جتنا ہے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اس کے بعد مزید ثبوت کے لئے  
تیار ہے خیمے کی خیمیں بلکہ ہماری جیب کی تلاشی کافی ہوگی۔

جی چاہتا کہ کاش، استقبال کے دوران لڑکی سے علیک سلک بھی ہو جائے مگر ہمارے  
چہرے پر نگاہ نہ ڈالے یعنی ہمارے چہرے سے کچھ ایسا جلال برے کہ اس کی دید کی تاب نہ  
لا سکے اور گردن سے اوپر آنکھ نہ اٹھائے، لیکن جب قریب پہنچا تو اس بے پاک فرنگ نے  
ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمارے اندر کے راز بھی پالنے۔ ظاہر تھا کہ ہمارے چہرے  
سے ابھی جلال کی بارش شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن اور شناختی پر یہ شروع ہو گئی۔

لینڈی کے ساتھ ساتھ ہم بھی جوانوں کے سامنے سے گزر رہے تھے، لیکن یوں معلوم

مگر ہوئی تو انکل ابھی نہ جوان ہو پائے تھے اور نہ ان کے جاننے کے ہی آثار تھے۔ چنانچہ انہیں  
بساط ہوائے دل پر ہی لیٹے چھوڑ کر ہم کیمپ کو سدھارے اور کیمپ میں اگر سلا کام یہ کیا کہ  
لاہور والے انکل کو خط لکھا کہ ہم نے اپنی ملائقی کی صفائی کر دی ہے اور انکل "من" کی  
ملاقات کی سعادت سے عاقبت سنواری ہے۔ چند روز کے بعد لاہور سے جواب آیا کہ شاباش  
چیٹے رہے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ محبت صالح تراصل کند۔۔۔

انکل "من" سے تو ہماری پہلی ملاقات آخری ثابت ہوئی، لیکن معاوی سے ہر روز قاہرہ  
جہاں ملتے تھے کیونکہ معاوی میں انڈین دنگ کی زندگی کی رفتار ایک نرم خرام ہندی کی مانند تھی  
جس کی سطح پر کوئی بلجائ نہ ابھرتا تھا اور جی بات ہے ایسی بے بلجائ زندگی ہمارے مزاج کو اس  
نہ تھی لیکن اچانک ایک دن انڈین دنگ کی خاموش زندگی میں ایک بلجائ نہیں ایک لفظ پیدا  
ہوا اور ہمیں قاہرہ جانے کی نہ حاجت رہی اور نہ ہوش نہ کوئی دس بجے کے قریب اپنے دفتر  
میں بیٹھا تھا کہ کرنل صاحب نے فون پر اپنے دفتر میں طلب کیا۔ کرنل صاحب کی آواز میں  
واضح اضطراب تھا۔ حاضر ہوا تو مجھے سامنے بٹھا کر سمجھنے لگے۔  
"کل شام ایک انگریز کارپورل اور ایک انگریز ہندی معاوی کلب کے قریب باغ میں  
بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے کارپورل کو ہسپتال کا نشانہ بنا دیا۔ آج صبح کارپورل ہسپتال میں  
مرگیا۔ لڑکی کا بیان ہے کہ قاتل شکل و صورت سے ہندوستانی نظر آتا تھا اور اس کے پاس  
اطلاوی سائٹ کا فوڈ کارپورل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قاتل ہمارے دنگ کا جوان ہو۔ ابھی جا کر  
اپنے جوانوں کو میدان میں "قاتل ان" کو۔ میں دس منٹ میں لڑکی کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔  
وہ قاتل کی شناخت کرے گی اور شناخت کے بعد انڈین دنگ کے خیموں کی تلاشی بھی لی جائے  
گی کہ شاید ہسپتال برآمد ہو سکے۔"

یہ سن کر اٹھا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ نہیں کہ  
اس بد قسمت کارپورل کی تفریح میں قتل ہونے والے ہم خود تھے بلکہ اس لئے کہ جس ہسپتال  
سے یہ بد تیزی کی گئی تھی اسی سائٹ اور ملنے کا ہسپتال ہمارے خیمے میں بھی پڑا تھا۔ آپ کا  
اس ہسپتال سے تعارف ہو چکا ہے۔ اور یقین ممکن تھا کہ دوسرے خیموں کے ساتھ ہمارے

ہوتا تھا کہ ہسپتال جیب پھاڑ کر نیچے کرنے کو ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ہسپتال تمام سکنا تھا لیکن کرنل صاحب کے سامنے جیب میں ہاتھ ڈالنا بدترین تھی چنانچہ جب تک پر پٹہ قسم نہ ہوئی ہم اپنی جیب کی استقامت کی دعائیں مانگتے رہے جو بالآخر مستجاب ہوئیں۔ کیونکہ پر پٹہ قسم ہوئی تو ہمارے جوان بے گناہ ثابت ہوئے۔ عجموں کی تلاش بھی ناکام رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اسقاط جیب کی شرمندگی سے بچ گئے۔ کوئی دس دن بعد قاتل کسی دوسری جگہ سے پکڑا گیا تو ہم نے اپنے بے گناہ ہسپتال کو جو باقی انڈر کر اؤنڈ زندگی گزار رہا تھا، روشناس ملحق کیا اور اسے ٹوپی پہنائے بغیر ڈنگے کی چوٹ میز پر رکھ دیا۔

## قاہرہ ○ آخری ایام

۱۹۴۳ء میں ادھر ہم معادی میں انڈین ونگ کی کمان پر چھا رہے تھے اور ادھر لیبیا میں لارڈ منگمری جرنیلوں اور اطالویوں کو بھگا رہے تھے اور ہاتھ ہاتھ نہیں یونس اور بزرے تک لے گئے تھے آگے مسند آ تھا۔ مجھ اور اطالویوں نے مسند میں کود پڑنے کی بجائے پیچھے دیکھا اور ہاتھ بلند کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر میں بیسیوں قیدی یکپاسہ اسروں سے بھر گئے۔ ایک کیمپ ہمارے قریب بلکہ بالکل ہمارے سایہ عاطفت میں کھولا گیا جہاں سے اطالوی سپاہی ہماری خدمت کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ پرائیویٹ برزینی کو ہمارے نیچے اور اس کے مضامعات کی ترجمان کی ڈیوٹی ملتی تھی ڈیوٹی ہمارا مستقل اردنی سپاہی محمد اقبال بھی کرتا تھا اور ہزاروں سے کمرا میں گانڈاز کار کچھ دہشتانی ساتھ۔ جب برزینی کی آرائش خیمہ دیکھی تو دنگ رو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خود لیونٹارو دو اوٹھی آکر ہمارے نیچے کی مونٹرا بنا گیا ہو۔ برزینی کی چابکدستی کی حسین ہم نے وافر سکڑوں سے کی جو جنگی قیدیوں کے لئے ایک نایاب نعمت تھے۔ چند روز گزرے تو برزینی نے ہمیں دنگش سا سرگٹ لائٹریٹش کیا۔ ہم نے "نہ نہ نہ" کی زنجیر کے ساتھ لشکر یہ واپس کیا تو برزینی آرام سے کہنے لگا:

"لے لیجئے میں نے آپ کی خاطر بنایا ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "تم نے خود بنایا ہے؟ یہ تو رائسن کے کارخانے کا معلوم ہوتا



بھر تشرعاً بتایا کہ اگلی نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ذرا ڈانٹنگ ہال میں اعلان کرو۔ میں ہال میں واپس آیا تو دروازے میں کھڑے ہو کر دانستہ طور پر ذرا ڈانٹائی انداز میں بولا:

”حضرات توجہ! ابھی ابھی ڈیوٹی افسر نے خبر دی ہے کہ اگلی نے آج سات بجے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔“

میرے منہ سے اس جملے کا ٹکنا تھا کہ وسیع ہال میں ایک لفظ بلند ہوا۔ تمام افسر مرعہ ہمارے وضع دار کر قل صاحب کے کرسیوں سے اٹھے۔ جو کچھ ہاتھ میں آیا: چھریاں، کانٹے، ٹینک، بھت کی طرف اچھال دیا اور خود ٹاپنے لگے۔ انگریز عجیب جانور ہے سنجیدگی کے موقع پر کینٹینٹ عرف بن جاتا ہے۔ کیا مجال جو رسوم و قیود سے ہٹ کر بات کرے؟ لیکن تفریح کا مقام ہو تو اس سے کوئی بے اعتدالی کوئی بد پرہیزی اور کوئی بے وقوفی بعید نہیں۔ کچھ دیر بعد ہنگامہ فرو ہوا تو جیوں نے چھریاں کانٹے جن جن کردارہ آراستہ کیے۔ کھانا ختم ہوا تو شراب کے دور شروع ہوئے جو رات بھر جاری رہے۔ انگریزوں نے تو خیر دشمن کو شکست دی تھی، ہارنے کی کیا تھا؟ غیر ارادی طور پر اس خوشی میں بھی غیر جانبداری رہے۔ موقع پا کر باہر نکلے اور نیچے میں جا کر سو گئے۔

اگلی صبح برزنی سے ملاقات ہوئی۔ خیال تھا بے چارے شکست خوردہ برزنی کو ہمدردی پیش کریں گے، لیکن برزنی خوشی سے چمک رہا تھا۔ حیرت ہوئی اور وجہ انبساط پوچھی تو بولا:

”جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اب جلدی اپنی سوئٹ ہارٹ سے ملوں گا۔“

تو دعوے کے ساتھ کہنے لگا: ”یہ میرا انتظار کر رہی ہے۔“

یہ دعویٰ دراصل برزنی کی اپنی قسلی کے لئے تھا اور حقیقت میں انگریزوں کا کزشتہ رات کا طرب بھی اتنا قوی نہ تھا جتنا ذاتی۔ ہر انگریز کو یہی خیال تھا کہ وہ جو بیچھے انگلستان میں بیٹھی ہے، واقعی انتظار کر رہی ہے یا کسی دوسرے نے اس انتظار کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انگریزوں کو امریکی سپاہیوں سے خصوصی خدشہ تھا جو ان دنوں انگلستان میں دخل در معقولات دے رہے تھے۔ جنگ میں زخمیوں اور مردوں کی تعداد کا بڑی احتیاط سے ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ لیکن

ہے۔“

بولہ: ”رائسن مشین سے بناتا ہے، میں نے اپنے ہاتھ اور اپنی ہتھوڑی سے بنایا ہے۔“

برزنی ایک ہنرمند نوجوان تھا اور بعد میں معلوم ہوا کہ ہر اٹالوی سپاہی کسی نہ کسی ہنر میں ماہر ہوتا ہے۔ اٹالوی سپاہیوں کا یہ معیار دیکھ کر اپنے سپاہیوں کا خیال آیا جو اکثر فٹون لطیفہ کو چھوئے بغیری پلنگ ہو جاتے ہیں، لیکن سوچا کہ ایسا ہونا برا بھی نہیں۔ اگر فٹون لطیفہ ہمارے سپاہیوں کے لئے ذریعہ عزت ہوتے تو آج دشمن افسروں کے لئے سگریٹ لائٹس تیار کر رہے ہوتے۔ سپاہی کا پہلا کام لڑنا اور دشمن کے ساتھ وہ سلوک کرنا ہے کہ سگریٹ تو کیا پانی تک نہ مانگے اور اس ہنرمند سپاہی بلادر خاں اور نانک پہلوان خاں بیکتا تھے اور ہیں۔

۱۸۴۳ء کے اواخر میں جنگ افریقہ سے نکل کر اٹلی جا داخل ہوئی تھی اور برزنی کے وطن کی حالت خاصی پتلی تھی۔ البتہ جرمن بیڑی بے پیکہی سے لڑ رہے تھے اور ہنر موسیقی کو کندھے پر اٹھا کر اہل روم کو تار تار تھا کہ تمہارا۔ اٹلی ڈیو ہے ہمارے ساتھ ہے لیکن اٹالوی اب ہر قیمت پر اسن اور سویوں کے لئے بے تاب تھے، چنانچہ ایک دن اچانک اٹالوی فوجوں نے ہنر سے آنکھ ہٹا کر قرینے سے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ خبر ہم تک ایک عجیب انداز میں پہنچی۔

اس شام ہمارے میس میں بڑا ڈنر تھا۔ کوئی سوئے تھا اور افسر کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ رسمی ڈنر تھا، خاموشی تھی اور افسروں تن کر بیٹھے تھے کہ کپڑوں کے علاوہ جسم کو بھی کلف لگا کر آگئے ہوں۔ اچانک ساتھ کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کسی بیرنگ نے فون لیا تو دوسری طرف سے مطالبہ ہوا کہ کوئی افسر آکر بات کرے۔ میں دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ اٹھا اور جا کر ریسیور کان سے لگایا۔ ایک بھان خیزی آواز سنائی دی۔ بولنے والے کیپٹن جارج تھے۔ ہمارے کمپ کے ڈیوٹی افسر۔ مجھے پہچان کر کہنے لگے:

”خبر سنی ہے؟“

”کون سی خبر؟“

”تو پھر نہیں سنی اور سنو: "Old Musso Has Had It"“

ان دنوں کا شمار نہیں کیا جاتا جو طویل مدتوں اور اذلی شکت کے کرشموں کی وجہ سے ٹوٹے ہیں۔

گتست قیامت دل کی صدا کیا؟

مجھے اس کرب کا اندازہ اس وقت ہوا جب ایک عرصہ کے لئے مجھے اپنی پونٹ کے گورے سپاہیوں کی ڈاک سن کر کرنے کی ڈیوٹی دی گئی۔ ہر چٹی ایک آہ تھی۔ ہر سطر ایک فریاد۔

"میری محبوبہ" مجھے بھلا نہ دیتا۔

"میری جان" میرا انتظار کرنا۔

"میری دلربا" امریکیوں سے بچ کر رہنا۔

مسولینی کی گتست میں ہر انگریز کو وہ لمحہ قریب نظر آیا جس سے پتہ چلے کہ اس کی محبت پر کوئی فیروزا کہ ڈال دیتا۔ بس اتنی سی بات پر یہ اعلان طرب تھا۔ لیکن دل کی دنیا میں یہی تو بڑی بات ہے۔ انگریزوں کا یہ خوف بجا بھی تھا۔ ایک تو یہ طاعون تھا جس میں انگریز لڑکیاں اور امریکی سپاہیوں کی باہمی سوانح کے قہرے بلکہ تصاویر بھی تھیں جنہیں دیکھ کر فکری فوجیوں کے دل چھلنی ہوتے تھے۔ دوسرے خود قاہرہ میں ان امریکیوں نے (جو ابھی ابھی نازل ہوئے تھے) اپنے والروں اور چوبنگ کم کے طفیل تمام مصری عورتوں کو انگریزوں سے چھین لیا تھا۔ وہی لڑکیاں جو قاہرہ کی رقص گاہوں اور ریسٹورانوں میں انگریز افسروں کی ہم نشینی پر بھی باز کرتی تھیں اب بگلی کرتے ہوئے امریکی سارے مشن بلکہ سپاہیوں کی ٹیموں میں بھائی بگلی کرتے ہوئے چلتیں اور پاس سے گزرتے ہوئے انگریز افسروں کو رحم اور حقارت کے طے بٹے جذبات سے دیکھتیں۔ بلکہ کئی شوخ طبع لڑکیاں انگریزوں کے جوش و رقابت کو بھڑکانے کے لئے اپنے سینوں پر پیش کے بنے ہوئے حروف U.S لگاتیں۔ یہ حروف امریکی فوجی اپنے کالر پر لگایا کرتے ہیں۔ انگریزوں سے اور کچھ عین نہ پڑا تو ان لڑکیوں کو Unserviceable یعنی ناقابل استعمال کہنے لگے کہ برطانیہ کی فوجی نکت میں U.S اسی لفظ کا مخفف ہے اور "کنڈم" مال کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ محض دل کو مصیبتی تسلی دینے کی

بات تھی۔ عاشا وہ بتانے مصر کی زلویئے سے بھی ناقابل استعمال نہ تھیں۔ پھر جس بلندی پر انہوں نے یہ ایس کا بلا لگا رکھا تھا انگریزی چھٹی کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہ تھی۔

انگریزوں اور امریکیوں کی چٹک نے بے شمار لطیفے پیدا کئے۔ انگریز امریکیوں کو جنگی نقطہ نظر سے اٹاڑی سمجھتے تھے اور ان کے لئے اکثر Yellow یعنی بڑول کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ امریکی اس پر ہنس دیتے اور اپنی چھاتیوں پر تمغوں کی طرف اشارہ کرتے لیکن تمغوں کی معنی کے معاملے میں خداوند ان امریکہ مت فیاض واقع ہوئے ہیں۔ ایک امریکی سپاہی اگر دو سال نوکری کر لے تو اس کی چھاتی پر قوس قزح اتر آتی ہے۔ چنانچہ انہی دنوں جب قاہرہ میں جیل منگھری کی فتح لڑائی کے حلق قلم دکھائی جانے لگی تو انگریزوں نے ازراہ قلعن مشورہ کر دیا کہ امریکی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو امریکی سپاہی قلم Desert Victory دیکھ لے گا اسے تمغہ دیا جائے گا۔ لہذا سینا شکت کا کوئی تر قائل ضائع نہ کیا جائے۔ امریکیوں نے اس مذاق کا جواب جلد میں مولوٹر کے ستارے پر دیا جہاں جرمن گولوں کی بارش میں اتر کر زور بازو سے جرموں کو میلوں و تحلیل کر رہے تھے۔

اس کے بعد قیام قاہرہ کے دوسری قابل ذکر واقعات ہیں۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں فیسٹ ورماکا اور دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہمارا اہل قازم وطن ہونا۔ ورماکا ہر حرکت میں ہنگامہ ہوتا تھا لیکن کہنے لگا کہ میری ورماکا پر ایسٹ ہوگی۔ تمہارے بغیر کوئی الوداع کہنے نہیں آئے گا۔ میں اپنی صاحب میں اسے قاہرہ شیش کو لے چلا تو راہ میں کہنے لگا: "ذرا فیفی (Fifi) کو بھی ساتھ لے لیں۔ سننے اس سے وعدہ کر رکھا ہے۔"

فیفی ورماکا جیتی دوست تھی چنانچہ فیفی کو بھی ساتھ بٹھالیا۔ لیکن اسٹیشن پر پہنچے تو دیکھا کہ تین اور فیفیاں علیحدہ علیحدہ کھڑی ہیں۔ ورماکا کو علم نہ تھا کہ اس کی باقی مشوقائیں بھی اسے الوداع کہنے آئیں گی۔ اوپر ہر ایک یہی کہے بیٹھی تھی کہ وہی ورماکا واحد دوست ہے جو خدا حافظ کہنے کو پہنچی ہے۔ چنانچہ جو نبی انہوں نے ورماکا کو دیکھا مختلف سمتوں سے اس کی طرف بڑھیں۔

وہ جو سب سے پہلے پہنچی ورماکا سے لپٹ گئی اور تراخ سے ورماکا کے رخسار پر ایک بات آواز

فخر کا کہ ہم نے کسی فٹ ایڈ کے استعمال کے بغیر قاہرہ کو الوداع کیا۔

بوسہ دیا۔ اصلی فیمنی سے یہ دیکھا یا سنا نہ جاسکا تو اس نے بوسہ گیر فیمنی کے ایک تھپڑ لگا دیا اور اس سے قسم گستاہو گئی۔ درما انیس علیحدہ کرنے لگا تو ایک تیسری فیمنی آگے بڑھی اور درما کو اپنی طرف کھینچ کر بولی کہ "جائے دو ان جھگڑاؤں کو" اب مجھے الوداع کہنے دو۔" لیکن بیکاری الوداعی رسوم کی ابتداء بھی نہ کہانی تھی کہ آخری اور چوتھی فیمنی نے حق شفعہ کے طور پر درما کو اپنی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ غریب درما میدان جنگ سے تو سالم واپس آگیا تھا لیکن میدان محبت میں اس کے پرزے اڑنے لگے۔ دیکھنے والوں کو رحم آیا تو منہ زور فیمنیوں کو یکے بعد دیگرے لگام دی اور درما کو بمشکل ریل کے ڈبے تک پہنچایا۔

درما ڈبے میں بیٹھایا تھا کہ اس فیمنی نے جو سب سے پہلے پہنچائی اپنی انگوٹھی اتار کر درما کے منہ پر دے ماری۔ یہی حرکت دوسری اور پھر تیسری فیمنی نے کی اور پلیٹ فارم سے باہر چل دیں۔ درما ان نیرودیشہ معشوقوں کی رفتار کو مانتے دیکھ کر غالب کی ہمنوائی میں کہہ سکتا تھا:

UrduPhoto.com

کس کے گھر جائے گا سیلاب کا صبر ہے بعد  
مکروہ جو اصلی فیمنی تھی اس کی محبت اس کے جذبہ رقابت پر غالب آئی۔ لپک کر ڈبے میں پہنچی۔ اگرچہ خود بھی خستہ تن تھی لیکن بڑھی اڈا زینور مسافر کے سر کو اپنی آغوش میں لے کر اس پر گھنی پٹکوں کا سایہ کر دیا۔ غریب درما نے قدرے اچھوڑی محسوس کی اور آنکھ کھول۔

بہنہ جانا ہوں جہاں چھٹوں گھنٹی ہوتی ہے

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

لیکن ایک بات واضح تھی کہ غریب الوطنی میں اتنے وسیع پیمانے پر عاشقی کرنا جان جو کموں کا کام ہوتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد گاڑی سبز کو روانہ ہونے لگی تو فیمنی نے ڈبے سے اتر کر ایک تر و مال ہلانا شروع کیا۔ ہم نے یہ منظر دیکھا تو ہمیں اپنے دوست کی جدائی کے علاوہ بیکسی عشق پر بھی بے اختیار رونا آیا۔

کوئی مہینہ بھر بعد اسی نرین سے ہم ملازم وطن ہوئے۔ خدا جانے یہ انوس کا مقام ہے یا

1- مسیحا کا یہ واقعہ ہو گیا ہے!

2- United States کا تھک

3- یعنی صراحتی ہے۔ یہ جہلی غمری کی توامات کے حلق و گمرہ ہی غم تھی۔

## مراجعت بہ وطن

۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء کو جب ہمارا جہاز اسکانیوس (Ascanius) سویڈن کی بندرگاہ سے نکلے تو قلم کو روانہ ہوا تو ہم اس کے پہلے انگریز مسافروں میں تقریباً واحد دیکھی تھے لیکن جس خوشی سے یہ واحد دل کھل رہا تھا وہ ان پہلے انگریز دلوں کو میسر نہ تھی۔ وہ صاف تھی کہ ہم جنگ سے وطن کو لوٹ رہے تھے اور انگریز وطن سے جنگ کو جا رہے تھے یعنی برا کے محاذ پر۔ اس روز ہمارے لئے پورے اڑھائی برس کے بعد وطن کی دید کا خیال کس قدر نشاط انگیز تھا! اتفاق سے اس سمندر میں سفر میں ہماری تفریح کے سامان ہماری توقع بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ نکلتی تھی۔ لیکن مراجعت وطن کی سرمت ان عارضی خوشیوں سے بالا اور برتری رہی۔

ہمارے ہم سفر میں خاصی تعداد غاک پوٹش انگریز لڑکیوں کی بھی تھی جو ہندوستان اور برا میں مختلف جنگی خدمات کے لئے جاری تھیں۔ یعنی کچھ نرسیں، کچھ ڈاکٹر، کچھ سیکرٹری وغیرہ۔ اگرچہ ان میں سے کئی ایک غاک وروی میں بھی خود شید و ماہ لگتی تھیں، لیکن وہ جن کے دم سے یہ وہ روزہ سمندری سفر ایک گھشت میں بدل گیا یہ باور وری اجرام غاک نہ تھیں بلکہ انسا (Ensa) کے باکمال ایکٹر اور باہرل ایکٹر سیں جو اسی جہاز میں برا کے محاذ پر اپنے برٹش ٹیموں کو تفریح بہم پہنچانے جاری تھیں۔ جنگی خدمت کے سلسلے میں یہ برطانوی جیٹری پیش



میں تھی۔

مسلسل جنگ اور مورچہ گیری سے سپاہی ایک روحانی قاتل کا شکار ہو جاتا ہے جو دشمن کی گولی سے بھی مسلک تر ہو جاتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بیچارے کو جس دل پہ ناز ہو جاتا ہے وہ دل نہیں رہتا۔ یہ انسا کمپنیوں کے قماشے اسی بے دلی کا دریاں تھے۔ جنگ میں سپاہی کے لئے عورت کی دید سے بڑھ کر کوئی دوائے دل نہیں اور انسا کی ایکٹریس اس نکتے سے آشنا تھیں یا آشنا کر کے بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب بھی دیدار عام کا اہتمام کرتیں تو کچھ چھپا کر نہ رکھتیں۔ ان دونوں ٹاپ لیس سوٹ کا رواج نہ تھا تاہم کسی سپاہی نے انسا کی ایکٹریسوں سے یہ شکایت نہ کی کہ ہم

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

یہی رعایتیں اس سندری سفر میں بھی روا تھیں بلکہ کبھی کے موسم کی وجہ سے رواتر کردی جاتی تھیں۔ اس موسم میں انگریز پاسپان محل کو شاہی نہیں چھوڑتا بلکہ دھکا دے کر اسے سندری میں ڈبو دیتا ہے۔ چنانچہ پورے سفر میں صبح سے شام تک تقریبات کا سلسلہ تھا کہ شہنشاہ ہونے پاتا تھا۔ جرمن آبدوزوں کا خطرہ تھا لیکن اس کا احساس سوائے سنتری کے کسی کو نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جرمن آبدوزوں کے کپتانوں کو اگر ہمارے جہاز کے حالات دروں کا علم ہو تا تو تار پیڑ بھیجے کی بجائے خود سمجھتے آتے۔ جہاں سارے سفر میں دشمن کی آبدوز کے متعلق صرف ایک ہی الارم ہوا اور الارم ہوتے ہی اہل جنگ اپنے اپنے پتے پاتے اور گانے کی رفتار اور تیز کردی تا آنکہ ”آئل کٹیر“ کا سنگل ملا اور سکون کے وقفے کا آغاز ہوا۔

سنتری ایک رات یعنی ۳۱ دسمبر کی رات بھولنے کی نہیں۔ سال نو کے خیر مقدم کی تقریب تھی۔ اس شب محل کے ساتھ شرم کو بھی غرق دریا کر دیا گیا اور دلوں کو جملہ رسوم و قیود سے پیش چھٹی ملی۔ نیم شب کی ساعت آئی تو اہل جہاز کے جنوں کا سلسلہ اس قدر دراز ہو چکا تھا کہ دامن کے چاک اور گریبان کے چاک کا فاصلہ ناپید تھا۔ اس بے جہلی میں خواتین نے دوسرا نمبر لیا گو ارا نہ کیا۔

مست کب بند قبا باندھتے ہیں!

۳ جنوری ۱۹۳۳ء کی صبح کو ہمارا جہاز آہستہ آہستہ بمبئی کی گودی میں داخل ہوا۔ میں ایک

مختصری نیند سے جاگا تو پورٹ ہول سے فنگلی نظر آئی۔ ایک بے تابی کے عالم میں کپڑے پہنے عرشے پر پہنچا۔ ارض ہند پر نگہ پڑی تو آنکھوں میں دھندلے سر سے آنسو چھٹک اٹھے اور جب خاک وطن پر پاؤں رکھا تو خدا جانے کتنی دیر احساس رہا کہ پاؤں کی بجائے جبین کیوں نہ رکھ دی۔

بمبئی میں ہمیں ٹرانزٹ کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔ یہ وہی کیمپ تھا جہاں اڑھائی سال پہلے ہماری دعا کو کسی بابو مزاج فرشتے نے محض چائپ کی لٹلی کی وجہ سے خدا تعالیٰ تک جانے سے روک رکھا تھا اور ہمارا مسند ربار کا سفر نہ ٹل سکا تھا۔ بہر حال اب خوش تھے کہ نہ صرف جنگ سے بچ کر آگئے تھے بلکہ کسی قدر سچا لو لگا کر انگریزی فائزی بھی بن چکے تھے اور طبیعت میں ایک جسم کی خان بملوری محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ کیمپ کے دفتر میں داخل ہوئے تو اندر اس بے تکلفی سے قدم رکھا گویا صاحب کفالتہ ہمیں ہیں اور انگریز کمانڈر انٹ نے بھی ہمیں خوش آمدید کہا تو اس پاک سے گویا ملک معظم نے ذاتی طور پر ہماری خاطر یہ ایات بھیجی ہوں۔ ملاقات کے دوران میں کمانڈر انٹ صاحب نے سنگل ٹریننگ سنٹریا لگوٹ میں تقریر کا حکم نامہ دیا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے ایک ماہ کی رخصت کا مژدہ بھی سنایا اور اسی شب فرنیئر میل سے ہماری نشست کا انتظام بھی کر دیا۔

دوسرے روز لاہور پہنچے۔ ہماری منزل تو آگے چکوال تھی جہاں سے اتر کر اپنے گاؤں مل کسر جانا تھا۔ لیکن گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر رکی اور ہم نے کمزری سے باہر جھانکا تو ہمیں وہی کالج محلے دنوں کے مانوس در و دیوار نظر آئے۔ وہی رس بھری پنجابی آوازیں کاتوں میں پڑیں اور وہی بھاگ بھری قیصیں اور شلواریں دکھائی دیں۔ ایک فیملی طاقت نے ہمیں لاہور اترنے پر مجبور کر دیا۔ اسٹیشن سے نکل کر چلے تو پہلے دند محسوس ہوا کہ لاہور کے کوہلوں میں چلنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے لاہور ٹھہرے۔ ٹھہرے کیا اپنے آپ کو لاہور کے سپرد کر دیا اور یوں محسوس ہوا جیسے لاہور ہماری سر سالہ اجنبیت کو دھو کر ہماری بائبل طعیر کر رہی ہے۔

دوسرے روز گھر پہنچے تو چھوٹوں کو بڑا پایا اور بیٹوں کو اور بڑا۔ لیکن گاؤں کی بڑی خبر یہ نہ

تھی کہ ہم نے انہیں کیا پایا بلکہ یہ کہ ہم خود کیسے پائے گئے۔ خبر مشہور ہو گئی کہ پستان آگیا ہے۔ محمد خان آگیا ہے۔ کتنا دھڑکا تھا اب دیکھو کیا جوان نکلا ہے۔ صاحب بن گیا ہے۔ سرگت بھی پیتا ہے۔ سکوت میں کھانا کھاتا ہے۔ نوکری پہرہ بھی معاف ہے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے چلنے کام چھوڑ کر ملاقات کو آنے لگے۔ ہم نے پہلے دو دن میں کوئی ایک ہزار معاف کیے ہوں گے اور بس اتنی ہی ہمارے گاؤں کی روانہ آبادی تھی۔ چھاتی دیکھنے لگی لیکن دل کو ایک عجیب سکھ حاصل ہوا۔ مینے بھر میں صرف چند روز اپنے گھر سے کھانا کھایا اور وہ بھی والدہ کے اصرار پر کہ مجھے اپنے بیٹے کوئی بھر کر دیکھ لینے دو اور جب بہت دیر ہو گئی تھی تو وہی کچھ کما جو صرف مٹی کی کھتی ہے۔ "بیٹا اب ساری فوج میں تم ہی بڑے افسر ہو نا؟" میں والدہ کو دیکھا اور سوچا کہ اگر اس بیکر محبت کا وہ چلا نہ ہوتا تو کیا مجھے وطن کی واپسی کا یہی اشتیاق ہوتا؟ پھر کسی جھگ کے جواب دیا: "جی ہاں ایک آدمہ چھوڑ کر سب میرے ماتحت ہیں۔" اور میں کی دنیا آباد ہو گئی۔ ویسے جی یہ تھا کہ ایک آدمہ نہیں بلکہ ایک لاکھ چھوڑ کر بھی نہیں اپنے ماتحت ڈھونڈنے کے لئے چراغ لگا کر صبح لائٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ جی کس کام کا جس سے میں کا دل دکھے؟

## سیالکوٹ میں ایک سال

مینے کی چھٹی پل بھر میں گزر گئی۔ سیالکوٹ کی تیاری کی۔ معافی کے سگنل سکول میں ہم نے جس کمپن اور اسٹاک کی جانشینی کی تھی وہ ان دنوں سگنل ٹرننگ سنٹر سیالکوٹ میں منتقل تھے انہیں تیار دیا کہ پہلے روز آپ کے یہاں بھروسوں کا اور روانہ ہوا۔ اور اسٹاک قیام قاہرہ کے دنوں میں اپنی بیوی کی بد صورتی کے قصے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ مقابلہ حسن کرانے والے کبھی بدلہ نہیں لے سکتا تھا۔ اور پھر اپنی بیوی کے حق میں ایک عتابانہ آنکھ مار کر شرارنا مصرع لایا۔

جیسے چٹھی پیر رکھ دی ہو تھے اب داسرہ دیا ہوا

میں یہ سمجھ کر مسکرا دیتا کہ شاید یہ سرداری کی دل لگی کا اندازہ ہے ورنہ سرداری بالکل بے قصور ہوگی۔

لیکن سیالکوٹ پہنچا اور بھائی جان کو دیکھا تو کمپن اور اسٹاک کی حق گوئی کے علاوہ ان کی مظلومیت اور نفس کشی پر بھی تعین آگیا۔ ظاہر تھا کہ محترمہ کج رجحان جہان میں بہت اونچا مقام رکھتی ہیں۔ ذاتی کشش کا یہ عالم تھا کہ اگر موصوفہ رخ روشن کے سامنے شمع کی بجائے بجلی کی کرنی کر کے پروانے کو دعوت انتخاب دیتیں تو پروانہ بے تحاشہ بجلی سے چمٹ جاتا۔

1. اگر نیشنل پبلشنگ ایسوسی ایشن

2. اس وقت پاکستان ایجوکیشنل سوسائٹی تھا۔

3. لی کر ایک دھڑلے ماقبہ ہے نہ پکڑا ہے ہمارے ملی مطلب میں واقع ہے اور اپنے گل کے پتوں کی دہ سے مشہور ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک گل کے پتے ہی کرکری دہ سے مشہور ہیں۔

رجسٹر کے اندر جھانکا تو معلوم ہوا کہ اکاؤنٹس افسری تو سراسر علم دریاؤ ہے۔ مثلاً یہ کہ اس میں کوئی جادو ہے جس کا نام ڈبل انٹری ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سنڈری کیڑے بٹر کھاتے ہیں اور کبھی سنڈری ڈیٹریں جاتے ہیں۔ حیران ہو کر سوچنا کہ الٹی یہ پری چہ لوگ کیسے ہیں اور یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے۔ لیکن قصہ مختصر اکاؤنٹنگ کے جملہ اسرار نمایاں ہم پر آخر تک آشکارا نہ ہو سکے۔ ہفتہ بھر کی بے نتیجہ جمع تفریق کے بعد اپنے دل سے گناہ میں کہاں اور یہ وہاں کہاں؟ یہی کھاتے اٹھا کر سیدھا خدائے سنٹر کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ اکاؤنٹس افسری اس خاکسار کے لیے کمال نہیں۔

خدائے نے مسکرا کر فرمایا: "بھئی بس کے ہی کیلو۔"

اور ہمارا کندھا تپکا کر رجسٹر لال سے حوالے کئے۔ واپس دفتر میں آیا اور اپنے پرنٹ اکاؤنٹس بلڈش لال سے پوچھا:

"سیاں بھئی بس کے اکاؤنٹس کیسے چلے جاتے ہیں؟"

مسکرایا اور بولا: "جیسے آپ سے پہلے ریز صاحب کھیلتے تھے۔"

اس کے بعد بلڈش لال رجسٹر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد مکمل کر لایا اور بولا: "جہاں ضرب کا نشان ہے ذرا دھتھلا کریں۔" دھتھلا ہو گئے تو کہنے لگا: "آج کا کام ختم ہو گیا۔"

خدائے نے مسکرا کر فرمایا: بلڈش لال دیانت دار آدمی تھا جس کے سارے ہم نے سال بھر نمایاں کامیابی کے ساتھ اکاؤنٹس افسری کی۔ پھر اچانک ایک نئے کپتان صاحب سنٹر میں تشریف لے آئے اور ہم نے اپنے پیش رو کی تقلید کرتے ہوئے تمام تر رجسٹر اور بی کھاتے مع اپنی بے پایاں محبت اور خلوص کے ان کے سپرد کر دیئے اور کچھ شکر پڑھا۔ ویسے اگر آپ سنٹر کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ہماری اکاؤنٹس افسرانہ خدمات کا ذکر سنری الفاظ میں رقم ہو گا۔

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی مگر کھلا

سیالکوٹ کی زندگی میں محاذ جنگ کی تکالیف نہ تھیں لیکن جنگ کے گھنٹات تمام تر موجود

ویسے کپتانی صاحب کو ایک اطمینان تھا کہ اگر کسی وجہ سے انہیں محترمہ کو شریا بن میں تھا بھی چھوڑنا پڑا تو ان کی عصمت کا بل بیکانہ ہو گا۔ کپتان صاحب دوست پرور آدمی تھے۔ ہر نئے دوست کو گھر لے جانے سے پہلے آنے والے صدمے سے آگاہ کر دیتے تھے کہ اچانک تعارف سے فریب کا دل ٹپل نہ ہو جائے۔ میں تو ایک سال سے اس حادثے کی تیاری کیے بیٹھا تھا۔ لہذا میرا دل فی الحال متحرک تھا۔

بعد میں جب مسز اوڈاسکھ سے مزید واقفیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ کپتان صاحب اسے بد نصیب نہ تھے بننے ہم سمجھتے تھے۔ مسز اوڈاسکھ نے تقسیم حسن کے وقت چٹک چٹک شدید غفلت برتی تھی لیکن مثل بننے وقت اس خاتون نے مستعدی کے علاوہ کسی قدر سکھاشاہی سے بھی کام لیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دنیوی معاملات میں افلاطون کو بھی دو چار کام کی باتیں بتا سکتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مانجھے کی صحت مند جینی تھی۔ مثل اور صحت کی اس نادر آمیزش نے ایک اور قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا جو حسن صورت سے کہیں زیادہ دریا ہو تا ہے۔ چنانچہ بعد میں مسز اوڈاسکھ کے احترام میں ان کی شکل بھی مانجھی نہ ہوئی۔

دوسرے روز دفتر گئے۔ کمانڈر انٹ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بولے:

"اچھا ہوا تم وقت پر آ گئے۔ کپتانی ریز (Rainer) کی رخصت ہو رہا ہے۔ اس سے

چارچ لے لو۔"

میں سمجھا کوئی کہنی ملے گی اور مزے سے کمان کریں گے مگر ریز کے پاس پہنچا تو کوئی گز بھر لپے اور اتنے ہی چوڑے رجسٹر بھی کھاتے رسیدیں اور کچھ نقدی اٹھا لیا اور میرے حوالے کرتے ہوئے بولا:

"With Love To The New Accounts Officer"

مجھے معلوم تھا کہ فوج میں لڑنے کے علاوہ بیسیوں قسم کے دوسرے پاز بھی بیٹھے پڑتے ہیں لیکن ایک لاغری امید تھی کہ ابھی ان حساباتی پازوں سے ذرا محفوظ رہوں گا لیکن اب جب کہ بیٹنا ہاتھ میں تھا اور پاز سامنے رکھے تھے کوئی مغر نہ تھا۔ چپکے سے چارج پر دھتھلا کر دیئے اور سگنل زینگ سنٹر کے اکاؤنٹس افسر بن گئے۔

یہ کہہ کر محترمہ نے ایک دسویں تو بھری اور پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ بچی بیٹھی تھی۔ میں نے اس بچی کو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا لیکن اب دیکھا تو ایسی بچی بھی نہ تھی۔ کوئی اٹھارہ سال کا سن۔ شکل کی شریف مگر آنکھوں کی شرر۔ وہی کانونٹ سکول کی آزادی اور خود اعتمادی کی سرگئی ہوئی۔ خیر کوئی بھی ہو، ظاہر تھا کہ غلط فہمی کا معاملہ ہے لیکن اوپر لی املاں کی نگاہ غضب میرے جسم و جان کے ساتھ دل وجود کو بھی چیر کر پار ہو رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے بچی صاحبہ کی خدمت میں خاموش پہل کی کہ آپ ہی املاں حضور کا مفاد دور کر لیں۔ محترمہ نے جواب میں غیر جانبداری سے مسکرایا اور تماشہ دیکھنے لگیں۔ بڑی بی نے برسا جاری دکھایا۔

"دو دن سے انتظار کر رہے ہیں۔ اب آتا ہے، اب آتا ہے یہ ہوتے ہیں پچھن ہوتے والے دامادوں کے؟ کہاں ہے تمہاری امی؟"

تو یہ بات تھی! ہم نے بی املاں سے آنکھ پھا کر بچی کو صاف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پروردہ غیر تحریری احتجاج کیا۔ جواب میں چھوٹی بی نے فضا انگریزی میں شانے سکیڑے اور آسمان کو کھنسنے لگی۔ گویا کہتی ہو: "یہ معرفت کا معاملہ ہے مجھ سے مت پوچھ۔ اپنے من میں ڈوب کر پابا سراغ زندگی۔" ہم نے ایک لمحے کے لئے من میں ڈوبنا شروع کیا تو چھوٹی بی نے ہماری سلامتی پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔ یوں جیسے لٹلی سے طلبے پر تھاپ پڑ جائے۔ اس پر بڑی بی چونک کر بولیں:

"آری چھو کر تو ہنس رہی ہے! ابھی تو دور رہی تھی۔"

"ثانی جان! یہ کیشتن نظر نہیں ہیں، کوئی اور ہیں۔" بچی نے ہنسی کو آدھا روکتے ہوئے کہا۔

"کوئی اور ہیں؟ پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہائے میں نے کتنی لٹلی کی۔"

بچی بولی: "کوئی بات نہیں ثانی جان! یہ بھی ہنس رہے ہیں۔"

میں ہنس تو نہیں رہا تھا، البتہ ہنسی روکنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔

ثانی جان بولیں: "بیٹا معاف کرنا، میری نظر کمزور ہے۔"

تھے۔ مثلاً بغیر وردی کے گھر سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ کلب جاؤ تو وردی میں اور بازار جاؤ تو وردی میں۔ سفید شریفانہ پہننے پس کر باہر نکلنے کو دل ترس گیا تھا۔ چنانچہ کئی مرتبہ رات کو گھر کی تنہائی میں سوٹ پہنا، آئینے میں دیکھا، دو حسرت کی آہیں بھریں۔ سوٹ اتار کر مسند وق میں بند کر دیا اور منہ بسور کر پھر غما کی وردی پہن لی۔ گویا اپنی کپتانی کا اشتہار زیب تن کر لیا۔

زندگی کی بے شمار چھوٹی چھوٹی خوشیاں صرف گمنامی میں ہی میسر آ سکتی ہیں۔ مثلاً چوک میں کھڑے ہو کر سلاہیت بیچنے والے کا پھر سنا اور علی الاعلان نسخہ بنانا، بندریا کا ناچ دیکھنا اور کھلکھلا کر ہنسا، استاد گام کی دکان سے سر بازار کباب کھانا اور اپنی آسودگی کی تصدیق ایک برہنہ ڈکار سے کرنا، سیکینڈل پوائنٹ پر کھڑے ہو کر ڈنگے کی چوٹ پل کی دھڑکن سنانا اور گلی کھا کر بے مزاج ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوچہ و گلی کے چکر لگانا اور شکل و صورت سے یوں دکھائی دینا جیسے خدمت غلطی کے لئے مارے پھر رہے ہوں۔ لیکن فوجی یونیفارم پہنی ہو جو کلف سے کڑکڑا رہی ہو اور کپتانی کا آئینہ شانوں پر اٹھا رکھا ہو تو پہلا کباب کھاتے ہی پہلی دھڑکن دھڑکتے ہی اور پہلا چکر لگاتے ہی۔ آئینہ چور نہیں اور اگر کورٹ مارشل کی قوت آگئی ہو ضرور اتنی چاہئے تو پھر کپتانی ہی کا فور سمجھیں۔ چنانچہ ہم فضا ان خوشیوں کی ہی تمنا کر سکتے تھے جن تک باوردی دھڑکی ممکن تھی۔ سوائے اس کے کہ کوئی خوشی یا ناخوشی از خود غریب خانے پر آدھک دے۔

اور کرنا خدا کا کیا ہو اگر ایک دن ہمارے بچکے کے صحن میں ایک بامکھڑا کرکا۔ تاکے میں سامنے کی نشست پر کوہنہ ان کے علاوہ ایک خاص مسمر خاتون سوار تھیں۔ تاکے سے اترے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئیں:

"تم ہو پاکستان؟"

عرض کیا: "جی ہاں ارشاد؟"

اور حیران تھا کہ خدا جانے آج کس بلائے خانہ انوری کو انتخاب کیا ہے۔ بڑی بی نے

جواب میں بے تامل چھوڑے مارا:

"تو شرم نہیں آتی؟ اس بچی کا دل تو زردیا۔"



فرد گزشتہ اتفاقاً یا سوا ہو جائے، نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ کرمل صاحب کوئی دوسری قسم کے سینئر تھے۔ میں جواب میں ڈراجمی کا تو آواز بلند کرتے ہوئے بولے:

”ہولو، سلیوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟“

عرض کیا: ”میں آپ کا ریکٹ نہیں پہچان سکا تھا۔“

کرمل صاحب رعب اور فخر سے چور ہو کر اپنے دائیں کندھے کے تاج کی طرف ترمیمی نگاہ کرتے ہوئے بولے:

”تاج تاج اور پھول میں فرق نہیں آتا؟“

عرض کیا: ”آج کل کے سائیکل تیزی سے جا رہے تھے اس لئے پہچان نہ سکا۔“

ارشاد ہوا: ”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سوائے انگریز کے کسی اور کو سلیوٹ نہیں کرتے۔“

یہ کرمل صاحب کی زیادتی بھی تھی اور بے ربطی بھی۔ مجھے کچھ اندازہ ہونے لگا کہ ٹیٹسٹ کرمل کسی بھگوان یا کسی اور کو سلیوٹ نہیں کرتے۔ یہ مطلب تو نہیں اٹھ سکتا۔

جب میں یہ کہہ رہا تھا تو پاس سے ہمارے یونٹ کا ایک انگریز پستان سائیکل پر سوار گزرا جس نے حسب ہواٹ میں آنکھ ماری جو یقیناً کرمل صاحب کو بھی لگی۔ لیکن اس نے کرمل صاحب کو سلیوٹ وغیرہ نہ کیا۔ کرمل صاحب نے مجھ سے مکالمہ جاری رکھا۔

”معلوم ہوتا ہے تمہارا ڈسپلن ٹھیک نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

نام عرض کیا، لیکن کرمل صاحب نام سے زیادہ یہ چاہتے تھے کہ ڈرے کا پنے اور معافی مانگے۔ جب ایسا نہ ہوا تو آپ نے ذرا زیادہ خوفناک حربہ استعمال فرمایا اور بولے:

”اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ؟“

شناختی کارڈ ہر وقت ہر افسر کے پاس ہوتا ہے۔ جب سے نکال کر ادب سے پیش کیا، لیکن کانپے سے پرہیز کیا۔ آپ نے کارڈ دیکھا۔ پھر اپنی نوٹ بک میں کچھ کوائف نقل کیے اور کارڈ واپس کرتے ہوئے بولے:

ثانی جان کی نظر بے شک کمزور تھی، لیکن آپ کی زبان ماشاء اللہ خاصی شہ زور تھی جسے آسانی سے معاف نہیں کیا جاسکتا تھا مگر اب ہم بھی سراغ پانچے تھے لہذا معاف کرنا ہی پڑا۔ اور سراغ یہ تھا کہ یہ خواتین ہمارے دوست ظفر کی منگیت اور منگیت کی بیٹی تھیں اور یہ ڈرامہ ظفر اور ہماری ہونے والی بھابی کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ظفر کی برات میں شمولیت کی یہ شرط رکھی تھی کہ ہمیں بھابی جان دینیگی دکھائی جائیں۔ سو ہمیں بھابی جان تو دکھادی گئیں لیکن اس انداز سے کہ ہمارا ثانی جان سے بلوہ ہوتے ہوئے رہ گیا۔ بے چاری ثانی جان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اس ڈرامے میں ان کا کردار محض قربانی کی نالی کا ہے۔

ایک اور بلاخانہ انوری کی بجائے انوری کے راستے میں آنچو وار ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں سینئر افسر اکثر انگریزی ہوتے تھے۔ ہندوستانی زیادہ تر فٹنس تھے یا پستان۔ کوئی بھولا بھٹکا بھجر بھی نظر آجاتا تھا لیکن کالا بیٹسٹ کرمل کالے گلاب کی طرح تقریباً ناپید تھا۔ ایک روز دوسری چھٹی کے بعد سائیکل پر میں کو جا رہا تھا کہ سڑک پر سامنے سے ایک اور سائیکل سوار آتا دکھائی دیا۔ پاس سے گزرا تو فٹنس سائیکل پر آتا تھا جس کے کندھے پر دو پھول ہوتے ہیں۔ انکی چھ گزری آگے نکلا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:

”Hey, Come Here“ (ارے۔ اور آؤ۔)

مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس گستاخ خدا کے مناد ہی ہم ہیں جس نے ان کو یہ صاحب خود کیوں نہیں آجاتے۔ بہر حال ہم ہی میں قدم پیچھے چل کر ان تک گئے اور دیکھا کہ ان کے کندھے کے دو پھولوں میں سے ایک تاج ہے۔ یعنی جناب بیٹسٹ نہیں، ٹیٹسٹ کرمل ہیں۔ معاً ہمارا ہاتھ سلیوٹ میں اٹھ گیا اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ہم سہو دبانے کرمل صاحب کے سامنے انٹرنیشن ہو گئے۔

ارشاد ہوا: ”جب ہم سامنے آ رہے تھے تو سلیوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟“

کرمل صاحب نے ذرا غیر متوقع چہرہ بچھین مارا تھا۔ فوج میں سینئر افسر کو سلیوٹ نہ کرنا جرم ہے اور اسے جونیئر سے باز پرس کا حق ہے۔ لیکن تجربہ کار افسر اس حق کو چھلندی سے استعمال کرتے ہیں، یعنی جہاں ضبط کا تقاضا ہو سختی سے گرفت کرتے ہیں، لیکن جہاں یہ

"تمہاری رپورٹ سب ایریا کمانڈر کو کی جائے گی۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

عرض کیا: "سر میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں؟"

فرمایا: "ہولو۔"

"سر، جب آپ نے سائیکل رکوا کر مجھے میں قدم پیچھے طلب فرمایا تھا تو میں نے اگر آپ کو سیلوٹ کیا تھا، لیکن آپ نے اس کا جواب نہ دیا۔ میرے سیلوٹ میں کوئی نقص تھا؟"

بولے: "ہم نے جواب نہیں دیا تھا؟ ہمیں خیال نہیں رہا ہو گا۔"

عرض کیا: "ایسا ہی ہو گا مگر ابھی ابھی ایک انگریز کپتان بغیر سیلوٹ کیے گزرا، لیکن آپ نے اسے تو کتنا مناسب نہ سمجھا۔ سرگستاخی معاف کیا آپ صرف کالے پکھلون کو ہی پکڑتے ہیں؟"

کرنل صاحب کے چہرے پر واضح گھبراہٹ تھی لیکن زبان میں دم تھا۔ بولے:

"یہ تمہارا بزنس نہیں۔"

میں نے کہا: "سر شاید آپ کو علم ہے یا نہیں، اب ایریا آؤر رقی روس سے سائیکل پر جاتے ہوئے سیلوٹ کرنا لازم بھی نہیں۔"

کرنل صاحب کو اس سوال کا صحیح جواب نہیں آتا تھا۔ اضطراب میں بولے:

"یہ ہمارا بزنس ہے۔"

عرض کیا: "مجھے بھی اس واقعہ کی رپورٹ اپنے کمانڈر کو کرنا ہو گی۔ اگر آپ کو

تکلیف نہ ہو تو کیا میں بھی آپ کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟"

اب اگر کوئی پلٹہ قسم کا جائدار سا کرنل ہوتا تو پہلے تو سیلوٹ پر بھگڑنے کی خطلانہ حرکت

ہی نہ کرتا اور اگر کر بیٹھا تو پھر ایک پکڑے ہوئے کپتان کی یہ جرات نہ ہوتی کہ الٹا شناختی کارڈ

مانگتا۔ لیکن ہمارے دیکھی بھائی بظاہر نوموٹو سے ٹیسٹ کرنل تھے اور غالباً اسی خاکسار پر پہلی

مرتبہ کرنل اُتار رہے تھے۔ یوں تو کیا ہی اچھا ہو تاکہ کرنل صاحب ہمارے پاس سے گزرتے

ہوئے مسکرا کر ہاتھ ہلاتے اور ہم اپنے ہم وطن کے اوج طالع اور نگاہ التفات پر فخر کرتے

ہوئے جو ابلی ہاتھ ہلاتے، لیکن اب کرنل صاحب گرفت میں تھے تو یہ کیل کا تصور نہ تھا، خود

آپ نے اسے ذرا انگ لیٹا تھا۔ کسی قدر جھنجھلا کر بولے:

"مگر تمہارا کارڈ دیکھنا ضروری ہے تو یہ رہا کارڈ۔"

کارڈ دیکھا تو لکھا تھا: "ٹیسٹ کرنل ڈی سوزا، پونٹنٹ ملٹری ہسپتال۔" گویا آپ ڈاکٹر

تھے۔ اب لازم نہ تھا کہ آپ کا نام پتہ یاد رکھنے کے لئے ہم بھی نوٹ بک کا سارا لیٹے، لیکن

ڈاکٹر صاحب کی ضیافت طبع کے لیے ہم نے کسی قدر اہتمام کے ساتھ جیب سے نوٹ بک

نکالی پھر ذرا خوش غلطی سے کرنل صاحب کے کوائف لکھے اور آخر کار سلیپے سے کارڈ تر

کر کے آپ کے ہاتھ میں دے دیا اور عرض کیا:

"مجھے جانے کی اجازت ہے؟"

کرنل صاحب نے جانے کی اجازت تو دے دی، لیکن ان کے دل سے بے آواز پکار اٹھی

رہی تھی کہ خدا کے لیے مت جاؤ۔ ہم سے گھر میں ہی صلح کر لو۔

میں میں پہنچا تو کمانڈر کی میز پر اس علاقے کا ذکر کیا۔ سامعین زیادہ تر ٹیسٹ اور کپتان

ہی تھے۔ گویا جو فخر افسروں کی بددوری تھی۔ ہمارے کارنامے پر خاصا فخر کیا گیا اور باقاعدہ فتح

منائی گئی۔

پچھلے پہر اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ کچھ پتین پکڑو رتی آنکلا اور بولا: "پلو تمہیں چائے

پلائیں۔"

ہم فوراً اٹھ بیٹھے۔ کیونکہ پہلی کی ٹی پارٹی ہمیشہ پر لطف ہوتی تھی۔ اس کے نصف

نصف صنف نازک سے ہونے کے علاوہ سچ نازک بھی ہوتے تھے جن کی ہم نقشی چائے کو

خوشگوار ذائقہ بخشتی تھی۔

پوچھا: "آج کس کو بلایا ہے؟"

بولے: "یہ سرہانزی رہے گی۔"

تھوڑی دور گئے تو پہلی بجائے ریستوران کے ایک بیٹھے میں داخل ہو گیا اور اندر جا کر

بے تکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں صاحب خانہ شریف لائے۔ جی ہاں، یہ

ٹیسٹ کرنل ڈی سوزا ہی تھے۔ پہلی نے باہم تعارف کرایا:

میںوں تک رسائی نہ تھی اور کالی بیگمات ابھی رقص کے میدان میں اتری نہ تھیں۔ زمین سخت تھی، آسمان دور تھا۔

----- وہ فٹری ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر مس بیٹنگ، جس کے شاف سرجن بننے کے بعد چھاؤنی کے نصف سے زیادہ افسروں کو درد دل کے دورے پڑنے لگے اور ہائے دل پکارتے پکارتے اس کے پاس جا پہنچے، لیکن مرض شناس خاتون نے ان کے دلوں کو ٹٹولے بغیر سوزا پائی کارب کی پڑیا تھما دی اور واپس کر دیا۔ اور وہ اس خاکسار سے تمام افسروں کی رقابت کر چکی تھی۔ بیٹنگ کو دوسرے مریضان دل کی پروا نہ تھی، ہمارے لئے اس کا دل سودا کا باب تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ بالکل صاف ستھری، غیر پوشیدہ اور پرتال کے لئے کھلی تھی اور وہ یہ کہ ولایت سے ہندوستان آئے وقت جہاز میں مس بیٹنگ ہم سفری نہ تھی بلکہ اردو میں ہونما رہوے کی طرح ہماری چٹنی چٹنی شاکر دہی تھی۔ سو قدرتی امر تھا کہ اگر استاد کے دشمنوں کی طبیعت کو کچھ ہو جاتا۔ اور اگر کچھ ہو جاتا تھا۔ تو سعادت مند شاکر دہی شتو سکوبہ القات خدمت احمد کو حاضر ہو جاتی۔ بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

لیکن سیالکوٹ کی زندگی کی جتنی مسرت اگر کہیں ملی تو وہ مس بیٹنگ کے القات یا ڈاکٹر ڈی سوزا کی عنایات میں نہ تھی اور نہ ہی قلعوٹ کلبوں یا قلعوٹ پارٹیوں میں بلکہ قلعوٹ کی تلاش تاجھ تکواڑ اور ان کی غول اطوار بیوی کے دولت کدے پر۔ خدا جانے ان دونوں نے مل کر دنوازی کئے کیلئے پر کہاں سے چھاپ مارا تھا کہ کیلاش کی صحبت میں جینو تو قلب تعمیر ہو گیا تھا اور بھالی ساوتری سے کلام کرو تو جادو ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں لوگ یا تو پیدا انٹی مسمان ہوتے ہیں یا پیدا انٹی میزبان۔ یہ میاں بیوی پیدا انٹی میزبان تھے۔ بخدا ہم پیدا انٹی مسمان تو نہ تھے، فقط یہ کہ تھا افسروں کو اپنے شادی شدہ دوستوں سے تواضع کی کچھ توقع ہوتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بھری چھاؤنی میں اس ساری تواضع کی ذمہ داری اس واحد جوڑے نے لے رکھی تھی۔ اگر بتول ابو بن ادہم خدا واقعی ان لوگوں سے پیار کرتا ہے جو اس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں تو خدا کی فرست میں ۱۹۴۳ء کے بعد ابو بن ادہم سے ادھر بھی دو نام ہوں گے۔

”میرا ولی دوست محمد خاں۔ میرے کرم فرما کر قریبی سوزا۔“

ابتدائی مزاج پر سیوں کے بعد چائے آگئی اور اس تکلف کے ساتھ کہ رستوران بھول گیا۔ پھر کر قل صاحب کا انداز تواضع: چائے پلائی تو شکر کھول دی۔ باتیں کیں تو امرت گھولنے لگے۔ آخر اٹھے تو کر قل صاحب نے آئندہ ملاقات کے وعدے پر اصرار کیا۔ قصہ مختصر ہازلے تو معلوم ہوا جیسے دل کا ایک ٹکڑا کر قل صاحب کے گھر چھوڑ چلے ہیں۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ اس منصوبے کا خالق چکرورتی تھا جس کی کر قل صاحب سے پرانی دوستی تھی۔ رہا وہ سیلوٹ کا معاملہ تو خدا جانے وہ کمن دو آدمیوں کے درمیان ہو گیا تھا۔ اس کے کہ جب دو چار ملاقاتیں اور ہو چکیں تو کر قل صاحب اور ہم نے اپنی نوٹ بکوں میں سے ایک ایک صفحہ بطور تعویذ ایک دوسرے کو پیش کر دیا۔ سیالکوٹ کی زندگی میں قاہرہ کا سا توجہ نہ تھا لیکن اس کی محدود دلچسپیاں تمام تر ہماری زد میں تھیں:

----- وہ پاکھلے کلب کی قلعوٹ پارٹیاں اور قلعوٹ ملاقاتیں، وہ بھلی اور قلعوٹ کی مشتبہ نشستیں جن میں سیالکوٹ کے کارخانہ دار اور ان کی بیویاں مقامی افسروں اور ان کی بیگمات کے آگے ہر شب سینکڑوں روپے ہار جاتیں، قدرت الٹی سے یہی بار دوسرے روز ہزاروں کی جیت میں بدل جاتی۔

----- وہ سینٹل میس کی ریمسٹل ہائٹ کی تقریبات جو رسمی ڈنر تھے، اپنی قواعد اور شادی نوست کی مقدس رسوم سے گزر کر مچھوڑے اور لذی پر جا ختم ہوتیں اور آخری منازل میں ڈھولک کر قل صاحب کے گلے میں ہوتی اور الفوزہ ایڈ جوٹ صاحب کے منہ میں۔

----- وہ مغربی رقص کی خاص راتیں کہ سفید جوڑے شب بھر پیتے اور تھرکتے تھرکتے اور پیتے۔ لیکن دیسی افسروں اور سے لگ کر وال پیچے بنے رہے کہ اکثر تو ناچنا ہی نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے ان کی القائے رقص بد دماغ میس دور سر کے ہانے چل دیتیں۔ حالانکہ اگلے لمحے میں ہی کسی انگریز کے بازوؤں میں ناچتے ہوئے مجسم اسپر دین جاتیں۔ اس جنگ پر ہم تمام لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں قوی بیانے پر اپنی غلامی کا رونا روتے کہ گوری

## ویکائی سنگل سکول کی کمان

مکمل پینچ کر چیف سنگل افسر ریگنڈر پوسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ریگنڈر صاحب نے پینچت مزاج کے بعد ہم سے گزشتہ تجربے کے متعلق سوالات پوچھے۔ جواب میں ہم نے اپنے اعمال نمائے کے چیدہ چیدہ گوشوں سے وہ سرکاریا۔ اعمال نمائے میں ایک جگہ رقم تھا کہ اس شخص نے قاہرہ میں مردوں کے علاوہ چند یہودی لڑکیوں کو بھی سنگل کی تربیت دی ہے۔ اس انکشاف پر ریگنڈر صاحب پچڑک اٹھے۔ مجھ سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور کسی کو مخاطب کئے بغیر بولے:

"Just The Man"

خدا جانے آپ کب سے اس خاکسار ایسے یگانہ روزگار کی تلاش میں تھے۔ اسی خوشی میں آپ نے فون اٹھایا اور رانچی سے کسی کرغل جونز کو فون پر طلب کیا۔ کرغل جونز لائن پر آئے تو ریگنڈر صاحب بولے:

"لونی، تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے یعنی تمہاری لڑکیوں کا۔"

"لڑکیوں کا مسئلہ؟" میں نے دل میں کہا: "یا اٹھی یہ ماجرا کیا ہے۔ اس خاکسار اور کرغل جونز کی لڑکیوں میں کیا رہا ہے؟ پھر مسئلہ بھی ایک لڑکی کا نہیں لڑکیوں کا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور شرع نے کڑی حد میں مقرر کر رکھی ہیں۔"

دونوں انگریزوں کی گفتگو شروع ہو گئی۔ میں صرف ریگنڈر صاحب کی باتیں سن سکتا تھا۔

قیام سیالکوٹ کے آخری دنوں میں ایک کرغل صاحب جی۔ ایچ۔ کیو ویلی سے شریف لائے اور مجھے حاضری کا حکم ہوا۔ حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ فوج کے محکمہ تعلیم کے اعلیٰ افسر ہیں اور چونکہ ہمارے سرکاری اعمال نمائے میں تعلیم کے خانے میں میٹرکولیشن کے علاوہ کچھ اور بھی لکھا ہے لہذا وہ ہم سے پوچھتا چاہتے ہیں کہ کیا ہم سنگل کور کو چھوڑ کر ایجوکیشن کور میں آنا چاہیں گے۔ سزیاغ کی سیر کراتے کراتے جناب کرغل صاحب نے بلخ کے ایک کونے میں ہمیں بھری کی جھک بھی دکھائی۔ دل ہی تو تھا کہ کینت شوق بھری سے بھر آیا۔ لیکن ہر چند کہ بھری کی کشش بے پناہ تھی تاہم سنگل کور سے ترک وفاقا تو بھی ہے۔ جہاں گداز تھا۔ چنانچہ ہم نے اقرار تو کر لیا لیکن کچھ ایسا مبہم اور محجوب ملاسا کہ وقت آنے پر یہ معنی بھی کھل سکیں اور وہ بھی "اور شارمین کا کسی ایک مطلب پر اتفاق نہ ہو سکے۔ چنانچہ کرغل صاحب ہمارا یہ وعدہ لے کر رخصت ہو گئے۔ دس دن بعد ہمارا چارلہ اچانک ایئرلن کمانڈ میں ہو گیا اور فروری ۱۹۴۵ء میں ہم عازم مکمل ہوئے گویا ہمارا کرغل صاحب سے کیا ہوا وعدہ اور پچیدہ ہو گیا۔

۱۔ میں بھی پاؤں نہ رکھتی ہے وہاں سو کاہرا لگ آتا ہے۔

۲۔ بے لکڑا شمس افسر کی نہ مہ میں محبت کے ساتھ



"آج ہی شام کی گاڑی سے چل پڑے گا اور کل تمہارے پاس ہو گا۔"

ٹیلیفون بند ہوا تو بریگیڈیئر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے اور بولے:

"یہ کرل جو نر تھے۔ کے 'ایل آف سی سٹیل رانچی کے کمانڈر۔ جو نر کی زیر کمان جوشید پور میں ایک بہت بڑا دیکائی یعنی لڑکیوں کا ٹریننگ سکول ہے۔ وہی ٹانگی جگہ۔ یہ سکول غریب جو نر کے لئے دو سر بن گیا ہے۔ کوئی افسر وہاں مینے سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بے مثال تجربے کی بناء پر۔"

دیکھا گیا۔ چنانچہ دو سر کے دن میں اپنے بے مثال تجربے سمیت رانچی پہنچ گیا۔ کرل جو نر سے ملاقات ہوئی تو انہیں بھی بریگیڈیئر صاحب کی طرح خوش مزاج پایا لیکن ذرا زیادہ حقیقت پسند۔ بولے:

"خان۔ دیکائی سٹیل ٹریننگ سکول کی کمانڈیوں تو دل کش ہے لیکن ذرا Tricky ہے۔"

UrduPhoto.com

اگلے روز جوشید پور پہنچا۔ سیدھا دفتر میں گیا۔ وہاں ایک اویس عمر کی اینگو انڈین خاتون مسز بیٹر تشریف فرما تھیں۔ آپ نے کتنی لگائی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا ہماری نیابت کا کام کریں گی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ تین سو ساٹھ لڑکیوں میں سے ایک سو پینس ہیں 'ایک سو اینگو انڈین 'ایک سو ہندوستانی اور ساٹھ گورکھا۔ گویا اچھی خاصی زنانہ اقوام متحدہ تھیں۔ بلور آفیسر کمانڈنگ سکول کے اندر ضبط 'تربیت وغیرہ کی ذمہ داری ہماری تھی لیکن ہوسٹل کے معاملات کے لئے مسز بیٹر جواب دہ تھیں۔ یہ معلوم ہوا تو ہمارا آدھا درد سر ہلکا ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ لڑکیوں کے نازک مسائل کی جائے پیدائش ہوسٹل ہی ہوتا ہے۔ کلاس میں ہوتا ہی کیا ہے؟ سبق؟ اگر کوئی لڑکی سبق بھول گئی تو آفت نہیں آجائے گی۔ جی چاہا تو ذرا غصہ ہو لیں گے ورنہ معاف کر دیں گے۔

بہت ہی گزرا تھا کہ ایک صبح سارجنٹ رامن آیا۔ سیوٹ سے ظاہر تھا کہ کسی کی شکایت لے کر آیا ہے۔ بولا:

"ہاں ہاں 'صبح آدمی مل گیا ہے 'یہ بیٹھا ہے کپٹن خان۔"

"تجربہ؟ ارے میاں 'سیکنڈوں یودی لڑکیوں کو پنڈل کر چکا ہے 'تمہاری لڑکیاں ان سے زیادہ منہ زور نہیں ہو سکتیں۔ ہا ہا ہا۔"

ایسا کرتے ہوئے بریگیڈیئر صاحب نے میری طرف اس توقع سے دیکھا کہ میں بھی ہا ہا میں ان کا ساتھ دوں لیکن میں صرف خفیف سی ہی ہی کر سکا۔ میں نے کبھی سیکنڈوں یودیوں کو "پنڈل" نہیں کیا تھا۔ فقط دس لڑکیاں تھیں اور انہیں بھی ایک قاصلے پر کھڑے ہو کر سبق دیا تھا۔ پنڈل کرنا عمارت بھی بدادب طور پر دور رس بات تھی۔ بریگیڈیئر صاحب بظاہر ان لوگوں میں سے تھے جو یک لخت مزے میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ اب آپ کرل جو نر کو ہمارے کوائف میں بتا رہے تھے 'ہمارے متعلق شاعری کر رہے تھے۔

"ہاں ہاں 'بالکل آسانی سے 'نوجوان آدمی ہے۔ کتنی چھوکیاں ہیں تمہاری؟"

"تین سو ساٹھ؟ پانچ اور کیوں نہیں رکھ لیتے۔ کیڈٹر مکمل ہو جائے گا۔ ہا ہا ہا۔"

"تھو ایسا تین سو ساٹھ لڑکیاں۔" ہم نے دل ہی دل میں سوچا۔ معلوم کیا کہ استعمال ہونے

والا ہے؟

بریگیڈیئر صاحب بدستور غن طراز تھے:

"شادی؟ ہاں ہاں 'شادی شدہ ہے۔" (اور بجائے اس کے کہ ہم سے تصدیق کرائیں۔

ہمیں آنکھ مار کر خاموش کر دیا۔) لیکن شادی نہ شادی سے کیا فرق پڑتا ہے؟ (نہیں) (دوسری آنکھ ماری)

بالکل بے ارادہ طور پر ہمارے ہونٹ بھی مکمل گئے جسے بریگیڈیئر صاحب نے اپنی داد

سمجھا۔ بولے:

"نوئی۔ تم خان سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ بڑا ٹائٹس فیلو ہے۔"

ہماری ستائش ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سامنے جگہ کر آو اب

عرض کموں یا بیٹھے بیٹھے دند کیڑا لاری کرلوں۔ مگنگو جاری تھی:

۔۔۔ ایسے خفیہ سرکاری سلوک کی توقع نہ تھی۔ کلونت کور نے تو رامن سے اس امید پر نکرتی تھی کہ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟ لیکن اب "اس" نے ہی لاج نہ رکھی تو پڑھو یہ ہو کر رہ گئی اور نگاہیں پچی کر لیں۔ میں نے سوال دہرایا۔

"پلیز بتاؤ کہ سارجنٹ کا حکم کیوں نہیں ملا؟"

کلونت کور بدستور خاموش تھی۔ اس کی نگاہیں زمین میں گڑی تھیں۔ عدالت نے سوال جاری رکھے:

"کیا یہ مطلب ہے کہ تمہیں اپنے قصور کا اعتراف ہے؟"

میرا یہ کتنا عجیب کلونت کور کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے سارجنٹ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا دروازے سے لگنا تھا کہ کلونت کور زار زار رونے لگی۔ اب عدالت کے سامنے یہ سوال تھا کہ طرہ قصور وار ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ طرہ عدالت کا قصور معاف کر کے رہا بند کر کے کیا نہیں؟ لیکن آنسوؤں کی رفتار سے واضح تھا کہ طرہ عدالت کی جاں بحق کا کوئی ارادہ نہیں ہم نے کلونت کور کو دلاس دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں کرسی عدالت خالی کر کے طرہ کو پیش کی اور اسے ضبط کی تھپن کرنے لگے۔

تھپن کے دوران ہمیں گزرا ہوا لڑکانہ یاد آیا جب ہم مردوں کی کمانڈ کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ جب کسی قصور پر دم مارتے جاتے تھے تو تازہ وردی پہنے رائٹ لفٹ کرتے کمرہ عدالت میں داخل ہوتے۔ وہ آنسوؤں کے بعد اکیس روز کی قید کا حکم سننے تو پھر جی سے سلیوٹ کرتے۔ رائٹ لفٹ کرتے کمرہ عدالت سے باہر نکلتے اور تین ہفتے کو از کاراؤ میں گزار کر ہنستے کھیلتے یونٹ کی زندگی میں اس طرح شامل ہو جاتے جیسے سینما دیکھ کر آئے ہوں۔ کہاں وہ سپاہیوں کی کمانڈ اور کہاں ان دیکھائیوں کی ناز برداری کہ

ہو کر اسیر رہتے ہیں راہزن کے پاؤں

مس کور کے لئے چائے کی پیالی منگوائی۔ اگرچہ حقیقی ضرورت محق گاؤ زبان مع خیرہ موارد کی تھی۔ مس کور نے دو گھنٹہ چائے کے پیئے۔ اس کی سسکیوں میں ذرا افاقہ ہوا تو ہر دو جہاں سے عموماً اور ہم سے خصوصاً تھا ہو کر چل دی۔

"سرگزشت رات کارپول کلونت کور کو ایک خفیہ چٹھی Decipher کرنے کو بھیجی گئی۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا: "جو کچھ کرنا ہے کرلو، کیپٹن خان مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

کلونت کور نے ایک جد تک درست کہا تھا۔ صرف دو روز پہلے اس کے والد جو جمشید پور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے مجھے ملے آئے تھے اور کلونت کور کو بھی ساتھ لائے تھے۔ کلونت کور ایک دراز قد، بواں سال اور دلآویز سکھ لڑکی تھی۔ اس کے نیم وار پیلے ہونٹ ہر لمحہ مسکراہٹ پر تھے۔ وہ چٹھی حسین تھی، اتنی ہی لازمی تھی۔ لیکن اس وقت فوجی ضبط کا معاملہ تھا۔ چنانچہ کلونت کور کو دفتر میں طلب کیا۔

کلونت کور آئی تو ہمارے دفتر میں اس نے ٹکٹھی سے داخل ہوئی جیسے چائے پر مدعو ہو اور ابھی اس نے ہمارے کمرے میں قدم رکھا تھا کہ ہم اس کی خوشبو کے نصف قطر میں آ گئے۔ ان حالات میں بے لاگ افسری آسان کام تو نہ تھا لیکن ہم جاہت قدم رہے۔ کلونت کور نے رامن کو کھڑے دیکھا تو ذرا چٹکی اور ابھی ایک قہقہہ لگا دیا۔ پھر اپنی خوار و مسکراہٹ کا رخ ہماری طرف موڑا، لیکن ہم اس وقت کرسی عدالت پر بیٹھے تھے۔ کسی جوابی مسکراہٹ کے بغیر خالص فوجی انداز میں کہا:

"کارپول کلونت کور۔ سارجنٹ رامن نے رپورٹ کی ہے کہ تم نے کل شام خفیہ

چٹھی کا صاف زبان میں ترجمہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟"

کلونت کور جھٹ میں بولی: "حزای بھوت بکدا اے۔"

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس غیر متوقع اور غیر فوجی جواب پر ہم نے ہنسی کو کیسے دبایا اور فوجی ضبط کی بحالی کے لئے کس مشکل سے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی کے آثار پیدا کئے۔ سنبھلنے میں خاصی دیر لگ گئی لیکن آخر کہا:

"کارپول کور۔ انگریزی میں بات کرو اور ٹھیک انٹن شن کھڑی ہو جاؤ اور میرے سوال کا جواب دو۔"

کلونت کور کو مجھ سے۔۔۔ یعنی ایک ہم وطن سے اور خصوصاً پر سوں کی ملاقات کے بعد

کے بعد افسس براہ راست وہاں جاتا ہے۔ لہذا آرائش کا سامان لے کر یہاں آگئی ہیں۔ کلاس میں آیا تو میں نے بھی وہی کچھ دیکھا جو آپ نے دیکھا۔ مجھے بھی آپ کی طرح ہنسی اور غصہ مل جمل کر آئے لیکن لڑکیوں نے مجھے وہ کہا جو آپ کو نہیں کہا۔ یعنی یہ کہ اگر جان کی امان چاہے ہو تو برآمدے میں کھڑے ہو کر جو کیداری کرو۔ دو سرے طرف ماس سونیا نے اپنا کتا کھڑا کر دیا۔ شاید آپ کی اس بد تمیز سے لڑ بھیڑ ہوئی ہو۔ میں ایک کلونٹ کور سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ میں سونیاؤں سے کیا الجھتا؟ آپ کو رپورٹ دینا بھی مناسب نہ سمجھا کہ کلونٹ کور کے بعد آپ کو براہ راست کلاس میں کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ اس وقت آپ کے لئے میں لڑکیوں کی ایک شوٹی اور جائے ٹوٹی کا انتظام ذرا مشکل تھا۔

گویا سار جنت رامن کو کلونٹ کور کے قصے کا آدھا افسس 'پورا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ کیا گزری تھی قہرے پہ گھر ہونے تک۔ ہم نے سوچا کہ اگر ان میں اینگو انڈین قہروں نے بھی گھر ہونا شروع کیا تو ہماری کپتانی چاہئے کافی بن کر رہ جائے گی۔ چنانچہ ناچار اپنی رائڈ کے ساتھ ساتھ کلاس میں آیا اور ماس سونیا کو کچھ کراچی بے بسی کا اقرار کر لیا۔

تری دنیا میں میں مجبور و محکوم

مری دنیا میں میری پادشاہی

دو دن خیریت کے گزرے۔ پھر دس دن مقامی فوجی ہسپتال سے ڈاکٹر کا فون آیا۔

"آپ سی او کی ڈیوٹی کالی سکول ہیں؟"

"جی ہوں۔"

"آپ کے سکول کی دو لڑکیوں نے آج صبح Sick Report کیا ہے۔"

"کیا ہو گا۔ خیریت تو ہے؟"

"یوں تو خیریت ہے۔ صرف ان میں سے ایک کے بچہ ہونے والا ہے۔ یہ مس جو لیا ہے۔"

خدا جانے میں یہ سن کر کرسی سے اڑ کر جھٹ کو کیوں نہ جا لگا۔ میں نے کہا۔

"کیا فرمایا آپ نے؟ بچہ یعنی یہاں تو سب لڑکیاں غیر شادی شدہ ہیں۔"

اب ہم پر روشن ہونے لگا کہ ہمارے چہرہ صاحبان اس سکول میں ایک مینہ سے زیادہ کیوں نہیں ٹھہراتے تھے اور یہ ابھی ابتداء تھی۔

لڑکیوں کی تعداد کے پیش نظر سکول میں شینہ کھائیں بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک شام ہم نے وائزلیس کی کلاس کا پکڑ لگایا جس میں پندرہ بیس اینگو انڈین لڑکیاں زیر تربیت تھیں۔ دروازے پر پہنچے تو ایک چھوٹے سے کتے نے ہارک مگر مسموم سی بھونک سے ہمارا راستہ روکا۔ ہم ابھی اس پر واضح کر رہے تھے کہ برغور دار کتے یونٹ میں ہی یونٹ کے کمان افسر تھیں بھونکتے کہ کمرے سے زنانہ سرگوشیوں بلکہ بھاگ دوڑ کی آواز آئی اور جب دروازے کے اندر قدم رکھا تو کیا دیکھا ہوں کہ لڑکیاں اپنی آرائش کی چیزیں۔ اپنی سنگ 'پاؤڈر' نیل پالش 'آئینے۔۔۔ تیزی سے اوپر اوپر چھپا رہی ہیں۔ آخر جب ہمارے احرام میں ناچار سینوں پر ہینڈ گنس تو معلوم ہوا کہ ہماری ہونٹار طالبات آرائش کے مختلف مراحل سے گزر رہی ہیں۔ کسی کے بالوں میں کرل لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے ایک ہونٹ پر سرخی ہے لیکن دوسرا فی الحال ابلت ہے۔ کسی نے اپنے چہرے کے لئے کچھ کالی تھیں لیکن ہمارے ہونٹار معقولات کی وجہ سے وائزلیس سیٹ کے عارضی شیٹنگ ہوئے ہیں۔

تو یہ تھی ہماری وائزلیس کی کلاس! کوئی کسٹ سال آؤں گے دل کا کرل ہوتا تو یہ افرا تفری دیکھ کر غصے سے لاوا بن جاتا اور ساتھ ہی طالبات کو بھی مجسم کروا دیتا لیکن ہمارے پہلو میں ابھی ملائم اور جو نیئر سادل تھا۔ چنانچہ ہمارا پہلا رد عمل تو ایک بے پناہ قہقہہ تھا جسے ہم نے چھینکوں اور کھانسی کی شکل میں خارج کیا۔ پھر اپنی کمان افسر کا تمام تر رعب چہرے پر اکٹھا کر کے کلاس سے پوچھا:

"لڑکیو تمہارا اسٹو سار جنت رامن کہاں ہے؟"

یہ پوچھ ہی رہا تھا کہ مقابل کے دروازے سے باہر برآمدے میں سار جنت رامن دکھائی دیا۔ کمرے سے نکلنے کے لئے اچھا بھانا تھا۔ باہر جا کر رامن سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سار جنت رامن نہایت سکون سے قصہ بیان کرنے لگا۔

"سر! آج یہ لڑکیاں گورے سپاہیوں کے کیمپ میں ڈانس پر مدعو ہیں۔ کلاس ختم ہونے

"جی ہاں، جیسی تو آپ کو بتا رہا ہوں۔ ورنہ یہ خوشخبری براہ راست سننے کی ماں کو سنا۔  
لڑکی سکول پہنچے تو مناسب ایکشن لیں۔"

"مناسب ایکشن؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"اضطراب میں بھاگ کر مسز بیٹر کے پاس پہنچا اور کہنا:

"مسز بیٹر غصہ ہو گیا۔ مس جولیا کے بچہ ہونے والا ہے۔"

مسز بیٹر جھومنے ہی ہوئی:

"تو پھر روکو اسے۔" اور یہ کہہ کر مسکرا دی۔

مسز بیٹر کی رگ عرافت محض میرا ذاتی اضطراب دیکھ کر پھڑک اٹھی تھی ورنہ بچے کی آمد  
ہم دونوں کے لئے مساوی طور پر مسرت تھی اور کچھ یہ بھی کہ ہماری کمانڈ میں یہ پہلا حادثہ تھا  
لیکن مسز بیٹر کی تو یہ کیفیت تھی کہ

ہوتا ہے شب و روز گھٹا ہوا آگے

رجسٹر میں کوائف دیکھے تو معلوم ہوا کہ جولیا کے والدین بھی بے رحمی سے ہیں۔  
چنانچہ میں نے فون اٹھایا اور مسز بیٹر کو بتایا کہ میں جولیا کے باپ سے بات کرنے لگا ہوں۔ مسز  
بیٹر بولیں: "اوں ہوں، باپ سے نہیں، ماں سے۔" اور یہ کہہ کر فون میرے ہاتھ سے لے  
لیا۔ جولیا کی ماں سے دو پیاری پیاری باتیں کیں۔ کچھ دیر بعد دو تشریف لے آئیں اور قصہ  
مختصر اسی شام جولیا کو لے کر اس کی خالہ کے پاس نکلتے چلی گئیں۔ اس کے بعد ہم نے کچھ نہ  
سنا۔ سکول کے رجسٹر میں جولیا کی غیر حاضری کے خانے میں لفظ بد ہنسی لکھا تھا۔

خدا جانے ہم کیا کیا امتحان لے کر کمان کرنے آئے تھے، لیکن ظاہر تھا کہ ان امتحانوں کے  
پہلے پھولنے کے لئے فضا ساز گار نہیں۔ دو چار دن کے بعد رانی سے ہمارے کہنی کمانڈر۔ بجر  
شاہانی معائنے کے لئے تشریف لائے اور بمشکل میرے پاس بیٹھے ہی تھے کہ گور کھاؤنگ سے  
اطلاع آئی کہ مس ڈاگورنگ پچھلی رات سے غائب ہے۔ بجر شاہانی نے میری طرف  
استفسار نہ دیکھا تو میرے منہ سے نکل گیا۔

"ووڈراکمنڈونگ گئی ہوگی، آجائے گی۔"

بجر شاہانی یوں بھی سنبھلی تھے۔ چمکے اور بولے:

"تو مس جولیا شاید لندن تک گئی ہوئی ہیں اور سنا ہے کہ ان کا پاؤں بھی ذرا بھاری  
تھا۔"

بجر صاحب معائنے سے پہلے بظاہر خاصی تعیش کر کے آئے تھے۔ ہم نے ناچار جولیا کی  
امیدواری کے سلسلے میں اثبات میں سر ہلایا۔ بجر صاحب کسی قدر فکلی سے بولے:

"بچہ کیسے ہو گیا؟"

بجر صاحب سوال کا کیا جواب دیتا۔ مجھ سے مشورہ تو کیا نہیں کیا تھا۔ عرض کیا:

"حسب معمول ہی ہوا ہوگا۔ لڑکی کے پلے جانے کے بعد میں نے تحصیل میں جانا  
مناسب نہ سمجھا۔"

"اختیاطی تدابیر کیوں نہ اختیار کیں؟"

بجر صاحب اب بھولی باتیں کر رہے تھے۔ عرض کیا:

"ایک اختیاطی تدبیر تو خود سرکار برکاتیہ نے کی ہے۔ یعنی لڑکیوں کے ہوشل کے سائے  
میں انگریز سپاہیوں کا رخصتی ٹیمپ کھول دیا ہے۔"

بجر صاحب بولے: "سرکاری پولیس پر کتنے چینی نہیں کی جاتی۔"

عرض کیا: "تو پھر قریبی پولیس پر بھی راضی رہنا چاہئے۔"

قصہ مختصر بجر شاہانی ناخوش ہونے اور رانی جاکر کرمل جونز سے ہماری شکایت کر دی۔  
انہیں رانی طلب کیا گیا اور ہم۔ ہزار شوق و جملہ سامان چل پڑے کہ شاید اس مکان نسواں  
سے امان ملے لیکن کرمل جونز نے قصہ سنا تو بولے:

"تعداد اکام لڑکیوں کو گھنٹل کی تربیت دیتا ہے۔ سو وہ اطمینان بخش ہے۔ ان کی اخلاقی  
نگرانی مسز بیٹر کا کام ہے اور جیشید پور کے حالات کے پیش نظر یہ بھی معقول ہے۔ باقی رہا بجر  
شاہانی تو وہ Jittery (ڈرپوک) ہے۔"

یہ تو ٹھیک تھا لیکن میں خود بھی اس زچہ و بچہ کی دیکھ بھال سے رخصت چاہتا تھا۔ عرض  
کیا:



"کیا ممکن نہیں کہ مجھے رانچی میں ہی کوئی موانہ کام دے دیا جائے؟"  
"ہوسکتا ہے" نہیں "ایک سال تک ممکن نہیں۔"

بڑی مایوسی ہوئی۔ سوچا کون جیتا ہے ان دیکائیوں کی زلف کے سر ہونے تک۔ اگر سال بھر ان کی نگرانی کرتے رہے تو ہم لیڈی ڈاکٹر بن جائیں گے۔ جشید پور سے بچنے کی تدبیریں کرنے لگے۔

دوسرے دن ابھی رانچی میں ہی تھے کہ اچانک ہمیں دفتر میں طلب کیا گیا۔ جی۔ ایچ۔ کیو دہلی سے ہمارے متعلق چٹنی آئی تھی کہ اگر یہ افسر ایجوکیشن کورس میں جاملے پر رضامند ہے تو فی الفور ہماری میں تعلیمی کورس کے لئے حاضر ہو جائے۔ ایجوکیشن کورس سے سیالکوٹ والی ملاقات یاد آگئی۔ اس وقت باوجود بھری کے سبزی باغ کے ہمیں سیکل کور چھوڑنا شوق نظر آتا تھا اور اب پھر سیکل سے قطع تعلق کا خیال ہمارے لئے سوچان روح تھا لیکن جب دیکائیوں کے غول اپنے نام مقول آنسوؤں اور ہمو لوہو بچوں کے ساتھ ہمارے تصور میں نمودار ہوئے تو ہم ہماری جانے کے لئے رضامند ہو گئے اور تیسرے دن وہیں پہنچ گئے۔  
ہماری کا قیام مختصر تھا۔ دو ماہ کے کورس میں ہم کو فنی تعلیم کے اسرار و رموز فاش کئے گئے اور کورس کے خاتمے پر ہمیں ایک مستند ایجوکیشنل افسر کے طور پر جی۔ ایچ۔ کیو دہلی کے حوالے کر دیا کہ جہاں جی چاہے استعمال کر کے دیکھ لو۔ جی۔ ایچ۔ کیو نے ہماری آزمائش کے لئے ہرما انتخاب کیا اور 21 جون 1935ء کو ہم کلکتہ سے پرواز کر کے کینیا چکے ہوئی اڈے پر اترے۔

## برما۔ بربادی و بحالی میں ہمارا حصہ

برما کی زر خیزی کے متعلق ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ زمین کو گدگد اڑو تو فوس کر مٹی بکیر دیتی ہے۔ جب ہم کینیا کے اڈے پر اترے اور گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو ظاہر تھا کہ اس سرزمین کو ایک مدت سے نینا غضب نہیں ہوا۔ تین سال کی دردناک جنگ سے اس کی کھیتیاں ویران اور بستیوں سناں چوٹ چکی تھیں اور دردناک تربیہ کہ اہل برما کے دل ویران ہو گئے تھے۔ اگر کسی لب پر غصہ تھا یا کسی آنکھ میں چمک تھی تو یہ بری لب و چشم نہ تھے۔ کوئی امریکی "انگریزی" یا ہندوستانی فوج کا قاتل سپاہی ہو گا۔ رہے جا پانی تو وہ برما میں آخری مرتبہ مسکرائے تھے اور اب جنگ بار کرشب فم گزارنے کے لئے سیام کو پسپا ہو رہے تھے۔

مضافات کینیا سے گزرتے ہوئے جا بجا کالہ سر نظر آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہ چند روز پیشتر زندہ جا پانی دہریوں کے سر پر غور تھے لیکن اس وقت برما میں زندہ جا پانی صرف دو قسم کے تھے۔ دو جو ایران جنگ تھے یا وہ جو اس حالت یاس میں بھی کسی کین گاہ میں اپنے فاقہین کی خاطر اپنی آخری کوئی محفوظ رکھے بیٹھے تھے۔

چنانچہ جس وقت ہم برما پہنچے ہماری فوج کشت و خون سے تقریباً فارغ ہو چکی تھی۔ ہمارا کام اب برباد برما اور برمیوں کو آباد کرنا تھا۔ گویا خالص قیمری کام تھا اور یہ قیمر ہم نے دل و جان سے کی۔ اگرچہ گاہے گاہے وسائل برما کی قیمر کے ساتھ ساتھ مسائل نفس کی قیمر میں

1- Wacili Signal School یعنی نائن کور کا سیکل سکول

2- ہائل دی جس کی ضرورت تھی۔

3- "K.L. of C Signals"

4- پوشیدہ اشارات و اعداد سے مطلب نکالنا۔

5- اپنی بیماری کی ڈاکٹر کو خبر کرنا۔

سانپ بھی سڑک پر اٹھتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے ہم جیب سواروں سے اپنی خراشوں کے لئے ڈنڈل مانگ رہا ہے۔

----- وہ سپاہ کے دیواروں کے سلسلے گویا دیوؤں کے دیار میں جا بٹکے تھے۔

----- وہ ہمارے روڈ کے ناگمانی موٹر جن کی گولائیوں سے خبردار کرنے کے لئے امریکی انجینئروں نے عام نشانوں کی بجائے بے لباس حسیناؤں کی تصویریں بنادی تھیں۔

----- وہ لاشیو میں ایک چینی رئیس کے ہاں دعوت چائے کے جس کی لطافت نے تمام سرخار حاکم اور افسرین کو اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

----- اور آخر میں ہمارے یونٹوں کے مسائل جن کی خاطر یہ سفر اختیار کیا تھا۔ ہم جہاں بھی گئے جوانوں کو شاداں پایا۔ کیا کہیں نہ پاتے؟ راشن کی فراوانی، بیسوں کی بیکرائی اور سب سے بڑھ کر آٹھ پری عکرائی۔ تعمیرات جو کر رہے تھے۔ چنانچہ واپس آکر ہم نے "سب اچھا" کی رپورٹ دی تو ہمارے افسرین نے ہمیں شاباش دے کر ہماری ترقی کی سفارش کر دی۔ گویا ہماری خدمت میں خیر و برکت سے ہم قدم سے ہی تھی۔

ادھر اچانک حکم شائع ہوا جس کی رو سے ہمارا تبادلہ کمیٹی سے مانڈے کر دیا گیا۔ یوں سمجھیں جیسے جہلم سے راولپنڈی، مانڈے کے متعلق اپنے گاؤں کے ایک جہاں گرو تاجر سے من رکھا تھا کہ دلی کی طرح ایک شہر ہے عالم میں انتخاب۔ اور یہ کہ رہے ہیں منتخب ہی وہاں روزگار کے۔ لیکن جہاں روکھا، خصوصاً اس کے قلعہ معلیٰ کو تو محسوس ہوا کہ انتخاب ضرور رہا ہوگا لیکن شاہ مندان کے زمانے میں ہی۔ اب تو قلعہ کے علاوہ جاپانیوں اور انگریزوں نے اسے اس تفصیل سے ویران کیا تھا کہ اس اجڑے دیار میں گھاس کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا اور اب اس کے ٹکڑوں یعنی ہم لوگوں کا ہمارا اس گھاس کے کھودنے پر ہی تھا کیونکہ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ گھاس مائیس بروڈر جراثیم سے لٹی پڑی تھی۔ چنانچہ پہلے چند ماہ ہمارا مشغل گھاس کھودنا ہی رہا اور ظاہر ہے کہ اس روپ میں ہمیں کوئی بے تعلیم مہاجر ہی منتخب روزگار سمجھ سکتا تھا۔ ہر حال جب چھ ماہ کی مسلسل کھدائی کے بعد مانڈے کی صحت بحال ہو گئی اور ہمارے محلے میں مستحقین روزگار کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو یکایک ہمارے ہیڈ

بھی الجھ گئے۔ لیکن دل ہی تو تھا۔ چنانچہ دوسروں کے حسن کارکردگی کے صدقے خطا کاروں کو بھی معاف کر دیا گیا۔ خود غالب نے بھی ان لوگوں کی معافی کی سفارش کی ہے:

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہنے؟

اور اہل دل کا ازل سے فتویٰ ہے کہ کچھ نہ کہنے چھوڑ دیجئے۔ چنانچہ چھوڑ دیے گئے۔ یہی خطا پوشی کی پالیسی تھی جس نے ہمارے قلعہ و رینگتہ نظام کو مینوں میں چالو کر دیا اور ساتھ ساتھ ہمارا اپنا نظام بھی چالو رہا کہ مزور خوش دل کند کار پیش۔

ہمارا تقریباً 5.5 ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں ہوا اور پہلی مرتبہ ہم سٹاف افسرین کی تقریب (G-3) مقرر ہوئے۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس آسامی میں ہمارا مقابلہ جاپانیوں سے بھی قوی تر نہیں ہے۔ یعنی دفتری کرسی سے جو مسلسل بیٹھک سے ہمارا جڑ و بدن بننے لگی تھی۔ ہم آج تک رجسٹر کی کھلی فضا میں روٹی دوں زندگی کے عادی تھے جہاں آبلہ پانی بھی ایک طرح کی رحمت تھی۔ اب آبلوں کی تو یہ بھی کمی نہ تھی، لیکن لٹل جگہ پر تھے اور یہ ایک ایسی زحمت تھی جس سے جنوں جیسا ستم ہو گیا تھا۔ آخر تک اگر اسے جی۔ ون (G-1) ٹینٹ کرمل انگل بی (tally) سے التجا کی کہ ہمیں کوئی بیرون در کالام دیا جائے۔ کرمل صاحب ایک دلواؤ سے بزرگ شخص تھے۔ انہوں نے "شہلی رہا کا دورہ کر لو کہ مختلف یونٹوں کے مسائل سے آشنا ہو جاؤ۔" اور ایک جیب ہمارے خوابوں کی کدی۔

ہم نے مینہ بھر میں مانڈے، سمیو، لاشیو، پاسو، چنیا، الفرض اور گھاسا چھان مارا۔

برہانوردی کی کچھ یادیں باقی ہیں:

----- وہ پھاڑوں پر پگھڑوں کی قطاریں کہ جب تک رہا یا پھاڑ ختم نہ ہوں، پگھڑے ختم نہیں ہوتے۔ ہمارے پھاڑوں نے جہاں کہیں کھنی نکالی ہے یا سرائی ہمارا ہے مہاتپد حاک کے شیدائیوں نے اسے پگھڑے کی ٹوپی پستادی ہے۔

----- وہ سڑک پر جا بجا بدھ کے سیرین (Serene) اور سکون بخش مجسمے کہ ہم بہت شکن بھی پاس سے گزرتے تو شائبی محسوس کرتے۔

----- وہ مانڈے سمیو کی سڑک کے دونوں طرف گھٹا جنگل کہ جس سے ریک کر

سوچتے رہے۔

لیکن ہمارا ہیڈ کوارٹر جس میں پچاس سے زیادہ افراد سیکڑوں متعلقین تھے بے فکرے اور زندہ دل قاتلین کا ٹولہ تھا۔ انہوں نے اوّلے اٹھا کر لٹک کر مارے۔ ادھر سمیو کے حزن خانے میں بھی کئی سدا بہار قسم کے لوگ تھے جو عارضی طور پر خواب سرا میں مدد و ہوش پڑے تھے۔ وہ جاگے اور ہر دو عناصر کا اتصال ہوا تو سمیو میں زندگی نے آنکھ کھولی۔ پہلے برف چمٹنا شروع ہوئی۔ پھر مارنے کو ٹی اور دونوں میں سنسان محلے چمٹانے لگے۔ دفعتاً سمیو نے سچ لگا کر تپ دینا شروع کیا اور اس کے گلی کوچوں میں فتنہ سلاں جیتیں تانے بننے لگیں۔ بار کورٹ بٹلر کی چلتی سٹیج پر مشربا جڑا کشنیاں کھیلنے لگیں۔ ریس کورس کارڈنگ، جگ جھوم واضح طور پر جوڑوں میں تقسیم ہونے لگا۔ ہمارے ہیڈ کوارٹر کے مرد کلرک غائب ہونے لگے۔ ان کی جگہ دھان پان بری اور اینگو بری لڑکیاں لینے لگیں اور ہمارے کافی آلود رفتار کشت زعفرانی میں تیریل ہونے لگے۔ حوالدار کلرک بٹا سنگھ کی جگہ مس پرل کا آنا گویا ایک نئے کی جگہ گوبر کا آنا تھا۔ یہ گوبر کپٹن گرین (Green) ویلیفیر افسر کے حصے میں آیا اور جن جذبات سے کپٹن صاحب نے دوسروں میں مس پرل کی آمد کا ذکر کیا وہ انگریزی الفاظ میں تھے لیکن فیض انہیں اردو کالیاں بھی پتا چکے ہیں۔ یعنی جیسے دیرانے میں چپکے سے ہمارا آجائے

کپٹن گوبین اس اینگو بری سینہ کے بحر میں ایسے کھوئے کہ کچھ عرصہ بعد خداوندان فوج کو انہیں حکماً "بدا کرنا پڑا۔ کیونکہ کپٹن صاحب کے سوا باقی تمام فوج کے ویلیفیر کا کام دھک سے رک گیا تھا۔

ہماری اپنی کلرک ایک نرم و نازک خالص بری لڑکی تھی "ماکن جی۔ بتنا پیا راتنام تھا" اتنی ہی نازک اندام تھی۔ ٹاپ کرنے کو ایک ڈرافٹ دیا تو ٹاپ کرنے کے علاوہ اصلاح بھی کر لائی۔ تعلیم پوچھی تو معلوم ہوا انگریزی میں ایم۔ اے ہے۔ جی چاہا اپنی کرسی خالی کر دیں۔ لیکن ماکن جی بہت سنبھلی ہوئی لڑکی تھی۔ بولی: "آپ کو کرسی مبارک۔ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلنے والی ہے۔ میں جلد ہی اپنی کرسی پر چلی جاؤں گی۔ یعنی بطور ایک پھرار۔ جنگ کے

کو ارٹر کو مانڈلے سے سمیو جانے کا حکم ملا۔ مانڈلے سے سمیو جانا بالکل ایسا ہی تھا جیسا راولپنڈی سے مری جانا۔

مری کی طرح سمیو بھی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک خوش مزاج سا شرجہ ہے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ایک برطانوی ہٹلین رنکمن سے سمیو منتقل ہوئی تھی تو ان کے خون کو گرمانے کے لئے ہماری فوج کے انگریزی روزنامے Seac نے اپنے مخصوص مغربی بے حیائی کے انداز میں یہ سرخی بنائی تھی:

"مژدہ جوانو۔ سمیو کی چھ سو دھیزائیں ہمارے لئے چشم براہ ہیں۔"

اس بات کو دو مہینے ہو چکے تھے اور ہر چند کہ اب شہر آنکھوں کی تعداد اور شوق میں خاصی کمی کا امکان تھا تاہم ایک موبہوم سی توقع تھی کہ سمیو کے دروہام سے کوئی بچی کچی آنکھ ہمارے انتظار میں بھی دابھوگی اور کسی نہ کسی درپیشے سے ہمارے مقدم میں بھی کسی رومال کو جنبش آئے گی۔ لیکن سمیو پہنچے تو کسی آنکھ کو یہ کہنے نہ سنا کہ تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ۔ بیسیوں درپیشے کھلے پائے۔ لیکن کسی ایک میں بھی سنا کہ رومال کھلے نہ رہا جس کا روئے سخن ہماری طرف ہو۔ اور آخر جب ایک کھڑکی میں سچا سچ ایک رومال ہٹا نظر آیا تو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ کسی معصوم کا دھلا ہوا آنکھیں سوکھ رہا ہے۔ گویا اس گھر میں بھی عشق و محبت کی داستان بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ گلاب چاکر سمیو میں زندگی کی رفتار زندہ رہنے کے لئے کافی نہیں۔

بات یہ تھی کہ ہمارے باقی شہروں سے کچھ زیادہ سمیو کا حسن اور شباب جنگ کی نذر ہوا تھا۔ سمیو کی خوشگوار ہوائ نے جاپانی فوج کے تمام تر ہوس پرستوں کو کھینچ لیا تھا۔ چنانچہ اب حسن میں رنگ تھا نہ شباب میں انگ۔ اگر اس وقت غالب سمیو آتھتے تو دیکھتے کہ ابو نے ہاتھ سے کمان رکھ دی ہے اور فزے نے کمر سے خنجر کھول دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں نہ گناہ میں لذت ہے نہ ثواب میں سواد۔ یہاں دو کانداری سے لے کر عشق بازی تک نقطہ انمول سے نیچے کے ماحول میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ پہلے دن سمیو میں داخل ہوئے تو ہمارے دلوں پر اوس کے علاوہ کچھ اوّلے بھی پڑے اور ہم دن بھر سر کو زانو پر دھر کر بیٹھے

گاتے تو کینٹن محمد امین کی سربراہی میں وہ اودھم مچاتے کہ انگریزوں کو اپنی ہندوستانی اہلیاؤں کی بنیادیں جتنی نظر آتیں اور وہ چاروٹا چاروٹا ہمارے کورس میں شامل ہو کر چلانے لگتے:

”مٹی ہے چرے پر مٹی مٹی ٹالاب کی“

یا جب بھی بھر شگھاڑا سنگھ وغالبی میں گوندھی ہوئی انگریزی میں حالات حاضرہ پر لکھ دیتے۔ ان دنوں کینٹ مشن ولی آیا ہوا تھا۔ اس سلسلے کے ایک لکچر میں آپ نے راجہ غنفر علی خان اور لارڈ چٹک لارنس کا ذکر کیا تھا۔ ان ناموں کے تلفظ کے متعلق لکچر سے پہلے اس خاکسار نے مشورہ کرتے آئے۔ آپ غنفر کو غنفر بر وزن خفراوا کرتے تھے۔ میں نے اسی تلفظ کی پر زور تاکید کی اور کہا کہ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔ چٹک لارنس وہ صحیح طور پر ادا کرتے تھے لیکن میں نے مشورہ دیا کہ آپ ’تیمینگ لارنس‘ کہیں تو گرامر کی رو سے زیادہ فصیح ہو گا۔

سردار صاحب دلی میں آئے۔ ان دنوں ویسی اور انگریز افسروں کے سامنے نہایت خود اعتمادی سے غلط فہمی دہرانے لگے۔ پہلی مرتبہ سامعین ذرا مسکرائے لیکن سمجھے کہ شاید سردار صاحب کی زبان کی لغزش ہے۔ مگر جب فاضل مقرر نے غنفر علی خاں اور ’تیمینگ لارنس‘ کی پوچھاڑ شروع کر دی تو پتہ چلا کہ سردار صاحب کی زبان نہیں ’دماغ‘ لغزش کر رہا ہے۔ پھر شگھاڑا سنگھ کا انداز خطابت! معلوم ہوتا تھا انگریزی میں جانی پڑھ رہے ہیں۔ سننے والے نہیں سمجھتے کہ بے حال ہونے لگے۔ چند ایک نے ہمت کر کے سردار صاحب کے تلفظ کی اصلاح کی کوشش کی، لیکن شگھاڑا سنگھ نے اپنے اصلاح کنندوں پر حقارت سے ہنسنے ہوئے ہمیں آنکھ ماری اور اپنے معترضین کو ٹھٹھکا کر کہا:

”پتو۔ پہلے گرامر پڑھ کر آؤ۔ پھر غلطی نکالنا۔“

اور اپنا لکچر جاری رکھا۔

لیکن سمیو اور مانڈلے کی گیتوں بھری کمائی میں گنڈ ہو کر ’امین اور شگھاڑا سنگھ کے علاوہ چند اور مشاہیر کا حصہ بھی تھا۔ مثلاً

-----  
تھیٹسٹ ریاض احمد خاں آفسر کمانڈنگ سپلائی ڈپ ماڈلے نو بری بادشاہوں

دنوں میں بیکاری کی بجائے نوکری کرنی کہ اس میں پیسوں سے زیادہ عافیت کا پہلو تھا۔“ ماکن جی کو بھی ہماری طرح فوج سے کوئی عائد تھا۔ محض حالات کا ساتھ دے رہی تھی۔

سمیو کے ویرانے میں ہمار آئی تو ہمارے لئے پھولوں کی بجائے تاج لائی یعنی ہماری موجودہ پروموشن کا حکم آیا اور ہم ’بجربن‘ گئے۔ کندھوں پر ’بجری لگا کر دیکھی تو محسوس ہوا کہ وزن بڑھ گیا ہے۔ آپ کسی نازہ ’بجربن‘ سے پوچھیں۔ پروموشن کی آج کل بھی یہی تاثیر ہے اور ہمیں ’بجری‘ کا فائدہ کچھ اس لئے بھی مگرا محسوس ہوا کہ ہمارے تین ماتحت کپتانوں میں سے دو انگریز تھے۔ وہی انگریز جن کی ملازمت کرتے کرتے ہم نے لاکھوں کے بول بے تھے۔ یوں تو جنگ انگریز کی تھی۔ ہم ویسی ان کے سینئر ہو کر لڑتے یا جو نیئر ہو کر بھڑجال ان کی خاطر ہی لڑ رہے تھے لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ انگریز افسروں کو سپاہیوں شانے ماتحت پانچ اور انہیں سلیوٹ کرتے اور یس سرکیتے سنا تو وطن کی تلافی کا کچھ غم بٹا ہو گیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ ان سے کوئی ٹھوس ساقصور سرزد ہو تو انہیں سزا دے کہ انھوں کو سا جلیانوالہ کابلہ بھی لیا جائے لیکن انگریز کم بہت اتنا اچھا ماکم نہیں جتنا اچھا ماتحت ہے۔ اس کی بجائے اس سے اتنی کڑا ہے کہ انتقام لینے کی بجائے انعام دینے کوئی چاہتا ہے۔ چنانچہ انگریز ماتحتوں سے ہمارے تعلقات چاروٹا چاروٹا دوستانہ ہی رہے۔

ہمارا تیسرا ماتحت ایک ویسی کپتان تھا لیکن اس قدر بیمار اور غریب ثابت ہوا کہ ہمارے باہمی رشتے سے افسری ماحقی خارج ہو گئی۔ یہ قہارام لعل گنڈ ہو کر۔ خوش حال و نیک۔ رونق آفریں اور شریر۔ مجھ سے پہلی مرتبہ برہائی میں ملا۔ ایک کپتان میں اتنے اوصاف کا مجموعہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آخر یہ کہاں کی مٹی ہے اور پوچھا تو وہیں کا نکلا جہاں کا ہونا چاہئے تھا یعنی پھولاں کا۔ یوں بھی خاک وطن کا مجھ کو ہرزہ دیا تھا۔ رام لعل ایک بالکل گرائیں دیو تا نکل پڑا۔ سمیو کی زندگی پہلے ہی پھولوں سے عبارت تھی ’رام لعل کی زندہ دلی نے اسے مسلسل پھلجھڑی بنا دیا۔

کبھی کبھی یہ پھلجھڑی پوری آتش بازی کی شکل اختیار کر لیتی۔ مثلاً جب کبھی تمام ہندوستانی افسر میں مل کر انگریزوں کو نشانے اور ستانے کے لئے ”ہرما کی لونڈیا“ کا کورس



کے بعد قلعہ مانڈلے کے پہلے شاہی قسم کے کیمپ تھے۔ آپ کے دربار میں اور دسترخوان پر ملائے عام تھی لیکن آپ کی نازک مزاج جیب مسماۃ رانی (جو ہمای کی بیویوں میں فہست لیڈی بھی جاتی تھی) آپ کے سوا صرف ایک اور بار لطیف کی مقفل ہو سکتی تھی۔ وہ بار لطیف بتدریج بنیم ریاض کی عقل اختیار کر گیا۔

-----  
 ٹینیسٹ عصمت اللہ چوہدری جن کی موجودگی میں کسی محفل کاؤس یا قریبے کا بے رونق رہنا ناممکن تھا۔ آپ کو بے وقوف و صوفیہ اور بے وقوف بنانے میں الہامی دستری تھی۔ حتیٰ کہ آپ نے شوخ و شک گدھوک کے دل پر بھی چکر لگا کے چلوڑا۔ لیکن ان چوکوں سے تو ہمای کی محفلیں رنگیں تھیں۔

-----  
 بجز چند را (دژرنی کور) میرے شریف خادم میٹ تھے مگر ایک ادب باش کتے کی ہنر کے مالک تھے۔ چند را خود بوہنی قسم کے چوہی تھے۔ لیکن پیر کے معاشقے زبان زد میبو تھے۔ پیر صبح و شام رفیقہ حیات کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور دوسرے کتوں اور ان کے مالکوں کے امن میں غل ہوتا، لیکن جب ہمای کے کتوں سے شک و گمان نہ رہتا تو سرزنش کرتا تو بے چارہ خاموشی سے سر جھکائے مالک کی تلخ ترش باتیں سنتا رہتا۔ آخر جمناؤ قسم ہو چکی تو آٹھ کھول اور صبر و رضا کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھتا۔ گویا کہتا ہو:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

اور پھر اولین فرصت میں چند را سے آٹھ پھا کر شہر میں عشق کرنے نکل جاتا تھا۔ اور آخر میں قبلہ و کعبہ ٹینیسٹ کرلی سید حیدر علی گروہری کمان افسر فیلڈ امبولینس کلاؤ جو ہمای کمانڈ کے ہر ہندوستانی افسر کو تعارف سے پہلے ہی دل میں جگہ دے دیتے تھے۔ پونٹ کے لوگ آپ کو کمان افسر سے زیادہ بڑے مرشد سمجھتے تھے۔ آپ اکثر ملتان کی زبان میں کلام کرتے جو ہمیں انگریزی کی طرح مشکل لگتی اور کبھی انگریزی بولتے تو اس کی ملتان بننا دیتے اور اپنے انگریز سامعین کو مستقل طور پر ہراساں رکھتے۔ آپ کی ہریات اور ہر حرکت میں تفریح کا پہلو تھا لیکن بھولے ہیں کہ عالم کہ غیبی کی بجائے پیار آتا۔ دل کے اتنے صاف جیسے معصوم بچہ اور مزاج کے ایسے شیریں جیسے ٹاؤر و شیرہ جو کسی یا بد کسی افسر ایک مرتبہ

آپ سے مل لیتا آپ کا مدح سرا ہو جاتا۔ لیکن

کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

ہزار ہا کا قیام ڈیڑھ سال کا تھا جو گویا ڈیڑھ لمحے میں گزر گیا اور اچانک ہمارا تبادلہ فرخیر کور میں پشاور ہو گیا۔ پارٹیوں کے ایک ناگزیر سلسلے سے گراں حکم مگر سرخرو لگے اور آخر میبو کو الوداع کہی۔ میبو سے رنگوں تک جیب میں سز کیا اور دیکھا کہ ہمارے قیام کے دوران ہمای کے بے شمار زخم بھر آئے ہیں۔ سر راہ بری بچوں کو دیکھا تو ان کے گالوں میں انگلیاں پڑتی تھیں۔ جوان خیالوں کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں تارے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف لمبائے دھاتوں کے کھیت و حوب میں یوں جھلکا رہے تھے جیسے بڑا زعفران نے حد لگا تک سبز سائن کے حقن کھول دیے ہوں۔ ہم نے دل ہی دل میں رو بہ صحت ہمای سے کہا کہ شاید تجھے احساس ہو یا نہیں مگر

ہمارے اشک تیری عاقبت ستوار چلے

"Tickle The Earth It Laughs In Harvest" - 1

(George West)

2- سناؤ کہ اسے ہنساؤ گناؤ

3- گناؤ کہ جس میں جہان کے مشور و زبیر اعلیٰ

4- تقسیم ملک کے بعد اس سے رشتہ کٹ گیا۔ مسلم نہیں تیرا کل کیا اور کھل گیا۔

5- آج کل ٹینیسٹ کرلی جو امین تھی سوہی کوہ۔

6- یہ نام ہم لوگوں کا ہوا ہوا تھا۔ آپ کا اصلی نام کچھ اور تھا۔

7- Pathetic معنی قابلِ رحم

8- بعد میں بجز ریاض احمد خان اے سی انیس

9- اب ٹینیسٹ کرلی عصمت اللہ چوہدری اے سی انیس سی

10- آج کل کو اور (دژرنی کور) سرجن جنرل پاکستان تھی۔

سلام کر کے چلا گیا۔ جب واپس آئے تو پیرا غیر حاضر پایا۔ اگلی صبح غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو بولا:

میں رہ کر انگریزی عادات اور خرافات پر بھی اب خاصا عبور تھا۔ استقبال کے لئے اس وفد بھی ایک انگریز میجر آیا، لیکن ہمیں محسوس تک نہ ہوا کہ گوراہے یا کالا۔ منٹوں میں ہی لوڈ ہوئے سے گزر کر چند ناقابل تحریر نکلات سے تعارف کی منٹیں طے کر ڈالیں اور جب سرو سز ہوئی میں ایک کمرے میں اپنا مسلمان اتار اتو میجر مور ہمارے بے تکلف پار تھے۔

دوسرے روز یونٹ میں جانے کا ہمارا مسلاؤں تھا۔ ہمارے ایما پر دھوبی نے ہماری وردی کو اکڑایا، پھرے نے پھولوں کو چمکایا، ہم نے سینے کو پھلایا، فوڑی کو اٹھایا، شکم کو پکپکایا اور پچھلے پیٹے کی جھپٹ کو روانہ ہوئے۔ ہمیں خیال تھا کہ یونٹ کے دروازے پر کوارٹر گاڑ دیں گی۔ ہم بحیثیت فیلڈ اسٹریٹس کی سلائی لیں گے اور کور کمانڈر صاحب سے ملاقات ہوگی لیکن جہاں ہمارے رہنے کے کارروئی وہاں کھلم کھارڈ گاڑ کا نشان تک نہ تھا بلکہ مجلس قانون سازی کی عمارت تھی۔ اتنے میں ایک مہزری پوش جوان آگے بڑھا اور کار کا دروازہ کھول کر بولا:

"پہ خیر رائے۔" (خوش آمدید)

ہم نے کہا: "ہم یہاں آئے ہیں۔" فریئر کو رہنا ہے۔"

بولے: "ہم دفعہ دے۔" (وہی تو ہے)

حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے ہیڈ کوارٹر کے لوازمات کیا ہوئے؟ نہ کوارٹر گاڑ ہے نہ سنٹری نہ ان شن نہ سلیمن ٹیجی فریئر کو رہے؟ آگے دفتر کے اندر گئے تو سب فوجی افسر سوٹ پہنے، ٹائیاں لگائے بیٹھے تھے۔ گویا اسمبلی کے ممبر ہیں۔ ہمیں دیکھا تو سب نے ایک جگہ ہنسنے لگایا اور میجر مور جو ان میں سے ایک تھے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے پڑے کر اؤنڈ کے انداز میں بلند آواز سے بولے:

"سینڈ ایٹ ایز۔ سینڈ ایزی۔"

جواباً ہم نے صبح کا روکا ہوا سانس خارج کیا۔ فوڑی کو حسب فٹا لگنے کی اجازت دی۔ حکم کو وہ امکان تک پھیلنے کی رخصت دی اور ان کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ فریئر کو رہنا کابینڈ کوارٹر سفید پوشوں کا وارہ ہے۔ وردی صرف قبائلی علاقے میں سکاؤٹ اور لیشیا کے یونٹوں میں پہنی جاتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر فقط چار پانچ افسروں پر مشتمل تھا جن کے دفتر

"مانٹرے خودی تو کما تھا کہ نہیں آئے گا۔"

ہمیں اب معلوم ہوا کہ کبھی مارے اوپ کے ہمارے لئے سینڈ حاضر کی بجائے غائب استعمال کر رہا ہے اور یہ کہ مانٹرے مراد ہم خودی ہیں لیکن وہ سکول والے مانٹر نہیں بلکہ آقائے ولی نعمت قسم کے۔ ہمیں انگریزی زبان کی کم مانگی پر رحم کیا کہ بڑی مذہب اور شائستہ بنی پھرتی ہے لیکن کسی کو تعظیم سے مخاطب ہی نہیں کیا جاسکتا اور اپنی اردو پر پیار آیا جس نے لفظ "آپ" ایجاد کر کے بے ادبی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ خواہ غل سمجانی ہی کیوں نہ مخاطب ہوں، بالمشافہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ غالباً مغربی زبانوں میں "آپ" کے مقابلے میں کچھ نہیں۔

چنانچہ ہمارا مدر اس کا قیام نہ تو کرا امر کی رو سے خوشگوار تھا، نہ عام بود و باش کے اعتبار سے۔ مثلاً راو چلنے ہوئے آپ کو ایک معزز آدمی سوچنے والی پٹے ہوئے ملتا ہے لیکن نیچے پاؤں سے نگا ہے۔ آپ اس بے رطلی پر حیران ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ مسخر کون ہو سکتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ موصوف سکرے نہیں، ہائی کورٹ کے جج ہیں اور اگر سب جج مل جائیں تو اسم گرامی پوچھتے ہیں تو حضور فرماتے ہیں:

"ایم۔ ایف۔ بندرم۔" اگرچہ حقیقت میں ہزاروں جج کا مطلب ہے۔ "ایم۔ ایف۔ اندرم!"

حمیں کو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے!

اور انداز گفتگو یہ ہے کہ مدر اس میں الف آخر کسی لفظ کے شروع میں آنے کی گستاخی کرے تو اسے ہی بتا دیا جاتا ہے۔ ہمیں مدر اس اور بنگور میں کوئی بفتہ بھر نہیں کیا رو کر گزارنا تھا وہ گنڈارا اور آخر۔ سمارجے صحابہ کو پشاور کے اسٹیشن پر فریئر میل سے اترے۔

معاہمیں چھ سال پہلے کا پشاور آتا یاد آیا۔ اس وقت ہم کچی کلی کی مانند دو دن کے نرم و نازک سے غم لٹھیں تھے اور اپنے انگریز استہیل کنندوں کی سرد مری سے کھٹا سے گھٹے تھے لیکن اب ہم میجر تھے اور خیال تھا کہ ذرا خرافات بھی ہیں۔ آخر وہ محاذوں پر جنگ لڑ کر آئے تھے۔ چھاتی پر اودے اودے، ٹیلے ٹیلے، پیلے پیلے قصبوں کی پوری ڈیڑھ قطار تھی۔ انگریزوں

بھولے کرمل صاحب! مونٹ نیشن سے ملنا تو دور کنارہ ساری جنگ میں ہمارا اور مونٹ نیشن کا دور میانی فاصلہ کبھی تین سو میل سے کم ہی نہ رہا تھا، لیکن اب دکانیت شروع ہو چکی تھی اور ہم سے ملاقات کی تفصیل کے لئے اصرار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے مناسب کسر تقسی مگر خاصے نامناسب مبالغے کے ساتھ ایک دلکش سا افسانہ پیش کیا۔ مونٹ نیشن کے ساتھ بے تکلفی کا قصہ سناتو انگریز سامعین سسم سے گئے۔ گویا کہہ رہے ہوں:

کہ یہ ٹوٹا ہوا تار آمد کامل نہ بن جائے

ہماری اچھی خاصی کھلم بندی بھی کر دی گئی۔

دوسرے روز ریگنڈیر (ریگنڈیر جنرل فرنیر کور) سے ملاقات ہوئی۔ انگریز دورے کو کامیابی کی کتنی سمجھتا ہے۔ حسب توقع ہمیں حکم ملا کہ کام شروع کرنے سے پہلے تمام لیشیا اور سکاٹ یونٹوں کا دورہ کر لو، پھر کام شروع کرنا۔

اس بھولے سے حکم کی تعمیل خاصی طویل اور ٹھیکل تھی۔ یعنی قبائلی علاقے کے طول و عرض میں کوئی تین ہزار میل کا جال بنانا تھا۔ اس وقت فرنیر کور میں آٹھ دس یونٹ تھے جو شمل میں ثقالت سے لے کر جنوب میں چین تک بکھرے پڑے تھے۔ اگر پی آئی اے کے نقشہ ساز ہمارے سفر کا نقشہ دیکھ لیں تو رشک کے مارے اپنے ڈیسک پر ہی کرکش (Crash) ہو جائیں۔

اس سفر میں چند روایتی صعوبتیں ضرور تھیں لیکن قبائلی تواضع اور کینٹین مومن شادی رفاقت نے انہیں سر نہ اٹھانے دیا۔ مومن شاہ ہمارے نائب تھے۔ قد کے چھوٹے ہونے کے بعد ذرا اور بھی چھوٹے تھے۔ یہی کوئی پانچ فٹ مفراچ۔ لیکن دل کے بڑے ڈبل چھان تھے۔ یعنی وہ چند خوبیاں جو اور چھانوں میں فرداً فرداً ملتی ہیں ان میں یکجا تھیں۔ شریف مگر فصیل، مہمان نواز مگر متین، انتقام، جاں نثار مگر زور رنج۔ ان خالص، بختون عادات کے علاوہ ایک عادت بہادر سکھ دوستوں سے بھی مستعار لی تھی۔ یعنی کوئی کام ہو، مستعدی سے کر ڈالنے تھے اور پھر آرام سے سوچتے رہتے تھے کہ کیسے کرنا چاہئے تھا۔

کے لئے مشقباتی اسٹیبل کی عمارت سے تین چار کمرے ادھار پر لئے گئے تھے۔

اس زمانے میں فرنیر کور پر انگریز افسر قابض تھے۔ وہی افسر کوئی ایک آدھ ی لیا جاتا تھا اور ہزار مشکل سے۔ بلکہ انگریز بھی خاندانی واسطوں اور پرانے افسروں کی سفارش پر لئے جاتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ لئے جانے کے بعد بقول قصے لاث کے بچے بن جاتے تھے اور باقی افسروں کو عوام سمجھتے گتے تھے۔ اس کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ یہاں آکر تنخواہ میں تین چار سو روپے کا اضافہ ہو جاتا تھا بلکہ قبائلی معرکوں کے انگریز نامہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے سکاٹ اور لیشیا کی زندگی کو ایک گمراہ افسانوی رنگ دے رکھا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب بچے ہوم کو کھانہ بھریاں (دورہ غیر) شور مچا، فقیرا سہی اور دوسری قبائلی جنگوں کے اصلی اور فرضی قصے لکھ کر بھیجتے تو انگریز نامیں اور معشوقائیں سمجھتی تھیں کہ بیٹا یا محبوب لارنس آف فرنیر ہو گیا ہے اور یہ مغالطہ خود انگریز افسروں کو بھی کتنا موافق آتا۔

ویسے قبائلی سنگستانوں کی زندگی میں کسی قدر دھماکا اور افسانے کا شائبہ بھی تھا۔ چنانچہ جب ہم نے اپنے غور کے کائنات پیش کئے تو ہمیں اپنی خوشنویسی سے باخبر نہیں آگیا۔ کیا گیا۔ یوں جیسے نوئی آر مسز ایک کی طرح ہمارا بھی شائق خاندان میں رشتہ ہو گیا ہو۔ کرمل بیریسن کو تو یقین ہی نہ آتا تھا کہ کسی انگریز کے اشارے کے بغیر ہمیں فرنیر کور کے قابل سمجھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ روز سکا تو ہم سے رازدارانہ سبب پوچھنے لگا۔

”یہ کھلا کیسے لگا؟“

اب ہم فرنیر کور میں آئے تو اس وجہ سے تھے کہ اس اسامی پر ہر طور کسی دہلی کو بھی آتا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ وہی ہم نکلے۔ لیکن کرمل بیریسن کے جواب میں ہمارے سامنے گپ لگانے کے لئے لامحدود میدان تھا۔ ہم نے بنیدگی سے کہا:

”مجھے خود سمجھ نہیں آتی سوائے اس کے کہ یہاں لارڈ مونٹ نیشن سے ایک ملاقات

میں فرنیر کور کا ذکر آیا تھا۔“

ہمارا یہ کہنا تھا کہ کرمل صاحب جھٹ بول انہی:

”That is It“



آپ اپنا فیملی ولایت کب بیٹے (بیٹے) گا۔ اور تو اب گری آئے والا ہے۔۔۔ اس وقت اگر کوئی کرل صاحب کو تھرا میٹر لگاتا تو تھرا میٹر کھول اٹھتا۔ کرل صاحب کی گرمیاں آپ کی تھیں!

لنڈی کو قتل سے پارا چتا رہے۔ کوہاٹ اور قتل کے سنگستان سے گزر کر دریائے کرم کی وادی میں داخل ہوئے تو ہم پر اس مقام کا راز کھلا جہاں اقبال حسن بے پردا کو بے حجاب دیکھ کر اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ہوں اگر شہوں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟ پارا چتا کا حسن کشمیر سے بھی زیادہ بے تلافی ہے۔ ہم نے پورے تین دن کرم لیٹیا اور اس کے کارویار کا جائزہ لیا۔ آخر دو دنوں کا بھی کچھ مقصد تھا۔ لیکن وہاں سے رخصت ہوئے تو حاصل دورہ کرم لیٹیا کے اعداد و شمار نہ تھے بلکہ رخ پارا چتا کے نقش و نگار جو آج تک ذہن سے محو نہیں ہو سکے۔

پارا چتا سے شگنوں کے علاقے میں تھیں اور میر علی کے راستے میراں شاہ پہنچے۔ یہ وہی میراں شاہ تھا جہاں سے ہم نے چھ سال پہلے جنگی زندگی کی ابتدا کی تھی یا انگریزوں نے کرائی تھی کہ ایک دوسرا انگریز پشاور جا کر رہ سکے۔ اس وقت ہم نیم لٹھیں تھے اور عالی دماغ میراں شاہ کو ہماری آمد و رفت کا احساس تک نہ تھا۔ اب میراں شاہ کے قلعے میں قدم رکھا تو نوپنی سکاؤٹس کے کمانڈر کرل سینڈ ہرسن خود خیر مقدم کو آئے اور میراں شاہ نے تو گویا اپنا اہلکار ہند کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور ہم نے بکمال فیاضی اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے۔

قبائلی سرداروں کو ہماری آمد کا علم ہوا تو ہم تواضع کے ہاتھوں محصور سے ہو گئے۔ وہ صوبیدار۔ بھر سے لے کر سپاہیوں تک کی طرف سے دعوتیں دے پھرتے تھے۔ ہمارا مزید کھانے سے انکار اور میزبان کا فقط ایک سالم و نہد اور کھانے پر اصرار 'وہ رات کو جوانوں کا بلبلہ اور دن کو زبانوں کا زلزلہ'۔

----- دوسرے روز دفتر میں کرل صاحب سے تعلیمی معاملات پر بحث ہوئی تو ہمارے علم و فن سے بہت مرعوب ہوئے۔ لچ کے وقت میں میں شکار کا ڈاکر پل لگا تو مختلف

ایک دفعہ آپ سلیکشن بورڈ کے سامنے گئے۔ آپ کو دیوار "الف" سے دیوار "ب" پر دو زنبور کی مدد سے زمین کو چھوئے بغیر پہنچنا تھا۔ کوئی ستر فٹ کا فاصلہ تھا اور زنبور کے استعمال میں تھوڑی سی چالاکی درکار تھی۔ اب سیدھے سادے پٹھان کو چالاکیوں سے کیا واسطہ؟ آپ نے اللہ کا نام لیا اور دیوار "الف" سے براہ راست دیوار "ب" کے لئے چھلانگ لگادی۔ بعد میں اگر آپ کی ٹانگوں کو کوئی آٹچ نہ آئی تو یہ آپ کا قصور نہ تھا۔ یہ پٹھان ٹانگوں کا عدم تعاون تھا۔ بڑے گزر چکا تو کہنے لگے:

"یار! وہ زبیر دوسرے زینے میں پھنسا لیتا تو میری میز می دیوار "ب" تک پہنچ سکتا تھا۔"

آپ کا ہفتے کے بعد بھی اتنا سوچنا نفیست تھا۔ کیونکہ عام حالات میں آپ کی دو سوچوں کے درمیان خاصا طویل وقفہ ہوتا تھا۔ لیکن کیپٹن مومن شاہ کی یہی سادگی اور صاف باطنی ہی تھی جس نے ہمارا دل موہ لیا۔ وہ نہ صرف اپنی نویدیں بلکہ غامیوں کی وجہ سے بھی پیارے لگتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ہمارے خانہ دل کے تئیں تھے اور آج تک وہیں رہتے ہیں۔ دورے کی ابتدا لنڈی کو قتل سے کی۔ جاتے ہوئے دورہ خیبر سے گزرے جس سے ہمارا پہلے بھی تعارف تھا لیکن گزشتہ چھ سالوں میں دورہ خیبر نے جنگ کی اس قدر تیاری کرنی تھی کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ سڑک پر جا بجا روڈ بلاک رکھے تھے۔ نیچے ہائے ٹینکوں کی رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ یوں جیسے ٹنکریٹ کی کمیوں آگ آئی ہوں۔ اب تو جج دورہ خیبر کے گناہ کر چکی تھیں۔ اور ہوا قرا کے چلتی تھی۔ لیکن ہمارا معاملہ ہوا سے ذرا مختلف تھا۔ ہم فرنیچر کوڑھیں افسر تھے اور دورہ خیبر کے لئے رکھوالے 'سوبے باگاہ سینڈ ہمارے کپٹے۔

لنڈی کو قتل پہنچے تو جس کو ارنڈ گاؤ کے معائنے اور سلامی کا انتظار یا اشتیاق تھا موجود پائی۔ قاریغ ہوئے تو انگریز کرل سے تیارہ خیالات ہو اور محسوس ہوا کہ جب اس نے ہمیں چائے پیش کی تو خود خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ کیونکہ فرنیچر کوڑھیں دورہ خیبر کے لئے غروب کا یہ مطلب تھا کہ سلطنت برطانیہ کے کم از کم دو سو ملے میل پر سورج بیٹھ کے لئے غروب ہو گیا ہے۔ کیپٹن مومن شاہ نے تو کرل صاحب سے یہ سوال بھی پوچھ لیا کہ "کرل صاحب"

کیپٹن مومن شاہ نے نہایت شستہ انگریزی میں جواب دیا:

۱۵

Your Pushto is A Little Too Good For Me

"Would You Mind Saying The Samething in English?"

طوطے اڑنے کا محاورہ سن رکھا تھا۔ آج ہم نے سچ مچ طوطے اڑتے دیکھے۔ انگریزی طوطے! اس کے بعد انگریزوں نے ہم پر حسب توقع دانت تو پیسے لیکن ادب اور قرینے سے۔

جنوبی وزیرستان کے قبائلی جوانوں کو جب علم ہوا کہ وہی مسلمان افسر آئے ہوئے ہیں تو انہیں اپنے لئے بے تاب ہونے لگے۔ ہم نے یہ تقریب دو سرے روز نماز جمعہ تک اٹھا رکھی اور جب مسجدوں کی مسجد میں گئے تو سینکڑوں صحت مند اور کسرتی سکادوں کی شوخی معانفت کے بعد پسیلین (پسیلین) بن کر رہ گئیں۔ اور "جوڑ بھڑا" ڈیر بھڑا کی بھڑا سے زبان مل کھا کر کھار کھار کیل کی شکل اختیار کر گئی۔ قبائلی علاقے میں اخوت اسلامی کا اظہار اچھا خاصا جسمانی بلکہ پسوانی معاملہ ہے۔ ملاقات کے جوش و خروش کے بعد جب ان لوگوں کی تعلیم کے معنی سمجھ کر آگیا تو یہ جاکر وزیرستان کی بارش کی طرح یہاں کی تعلیم کی اوسط بھی کوئی ایک-ایک سالانہ کے لگ بھگ ہی ہے۔

الغرض یہی کیفیت ڈوب لیٹا اورٹ سنڈے مین (اور ٹین سکادوس (چمن) میں نظر آئی۔ انگریز افسر خوشحال سپاہی خوش، علم کی قلت، چلم کی کثرت، معانفتوں کی شدت اور پسیلوں کی شہادت۔ لیکن دو سری طرف جہاں اور محلت گئے تو ان لوگوں کا مزاج کسی قدر مختلف پایا۔ یہاں کا درجہ حرارت اور درجہ اخوت دونوں مقابلہ "ملائم" تھے۔ لوگ بامروت تھے لیکن مروت کے اظہار سے بڑی پہلی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ چائے یہ بھی پلاتے تھے لیکن بڑی حلیم سی، جو بیشتر زرد رنگ کا بے ضرر سا شیر گرم پانی ہوتا تھا جسے بڑی تواضع سے پیش کرتے تھے۔ وہ درہ کوہاٹ والا اہلتا ہوا سیاہ لاوانہ تھا جو جناب میزبان ہزار بیٹے یا بیویوں میں کم و بیش ڈنڈے کے زور سے پلاتے تھے۔ ان لوگوں کے چروں سے خوشخواری کی بجائے غاساری چیتی تھی۔ ری تعلیم تو وہ یہاں بھی اتنی ہی جوڑ بھڑی تھی جتنی خیبر اور وزیرستان میں۔

آخر سرحد پٹانی ختم ہوئی تو کوئی مہینہ بھر بعد ہم پشاور لوٹے۔ اب ہمارا کام فرخیز کور کے

پرندوں کے نام لئے جانے لگے۔ اس ضمن میں کرنل سینڈ لیسن ایک پرندے کا اردو نام پوچھ بیٹھے جسے انگریزی میں بسترڈ (Bustard) کہتے ہیں۔ اس خاکسار کا علم و فن جواب دے گیا اور لاطینی کا اظہار کرنے والا ہی تھا کہ مومن شاہ نہایت آرام سے کسی قدر عالمانہ انداز میں بولے:

"اردو میں اسے ناباز اولاد کہتے ہیں۔"

کرنل سینڈ لیسن اردو سے خاصے آشنا تھے۔ ہماری غن جمنی ان پر آشکارا ہوئی تو مضمون بدل کر مومن کی بات کرنے لگے۔ حسب معمول کوئی مہینہ بھر بعد کیپٹن مومن شاہ اس کرتے لگے۔

"یارا، وہ بسترڈ کے معنی خود نیک (نہیک) نہیں تھے۔ یہ واؤس تو پرندہ ہوتا ہے۔"

میراں شاہ کے بعد ہماری منزل بنڈولہ تھی۔ پہلے تو شام کا وقت تھا۔ شام کے دھندلے میں جنوبی وزیرستان کے کوہ و دمن خیبر سے بھی دھندلکھ نظر آتے ہیں۔ وہی عظمت اور وہی شان دلاؤ بڑی، لیکن بہت بڑے پتارے پر ہمارے دل نے اس کشش کی شدت محسوس کی۔ بنڈولہ کے قلعے میں داخل ہوئے تو اس کے وسیع صحن میں سبز گھاس پر دس بارہ انگریز افسر ہیں بائیس مختلف نسل کتوں کے دائرے میں محالیم کرسیوں پر بیٹھے بی رہے تھے۔ ہمیں داخل ہوتے دیکھا تو خیر مقدم کے لئے ہماری طرف بڑھے۔ انگریز نہیں کہتے! اور گرم جوشی مگر خاموشی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ایسے انگریز اپنے کتوں کو بھونٹا دیکھتے تو انہیں جنگلی کہتے ہیں اور ایسے کہتے اس نکتے سے آشنا ہیں۔ لہذا اول تو بھونکتے ہی نہیں اور ایمر جمنی میں کچھ کرنا ہی پڑے تو بھول پلٹس بجلی سی بخروہیتے ہیں۔

انگریزوں کے قریب پہنچے تو انہیں اپنے کتوں سے بھی زیادہ کم کو پایا۔ لیکن ان کی کم گوئی تہذیب کا نشانہ تھا بلکہ چلاپے کا اظہار تھا۔ اس قلعے میں آج تک کوئی غیر انگریز داخل نہیں ہوا تھا سوائے اس کے کہ ہیرا ہوا اردلی۔ اور آج یہ مقدس روایت بنڈولہ کی نرم و نازک گھاس کے ساتھ پال ہو رہی تھی۔ ایک انگریز بھرے بعد مشکل کیپٹن مومن شاہ کو پشتوں میں کچھ کہنے کی زحمت گوارا کی کہ اپنے بیروں خانساہوں سے بولنے کا یہی انگریزی دستور تھا۔

امتحان کے لئے سلیکشن بورڈ میرٹھ کے سامنے حاضر ہو۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو رات کی گاڑی سے جانا تھا لیکن معلوم ہوا کہ اسی روز ہمارے سیاسی رہنما آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک اہم اعلان کرنے والے ہیں۔ چنانچہ دوسرے ہی ریڈیو سے لگ کر بیٹھ گئے۔ پہلے مونٹ نیشن بولے 'پھر پنڈت نہرو اور ان کے بعد قائد اعظم'۔ ہم نے ابھی تک قائد اعظم کی تقریریں صرف اخباروں میں ہی پڑھی تھیں۔ لیکن آج پہلی مرتبہ ان کی پر شکوہ آواز سنی تو ہمارے سینوں میں توانائی آنے لگی اور اپنے قائد پر بے حساب فخر محسوس ہوا۔ لیکن قائد کی آواز سے بھی زیادہ نشاط انگیز وہ خط تھا جو ان کی تقریر کا موضوع تھا۔ یعنی یہ کہ دو ماہ بعد ۳۱ اگست کو پاکستان قائم ہونے والا تھا۔

اس ایک پیام سے ہماری توجہ بڑھ گئی اور فوراً اپنے آپ سے پہلا سوال یہ کیا کہ اب میرٹھ جا کر یعنی ایک غیر ملک میں ریگولر کمیشن لینے کے کیا معنی؟ کیوں نہ پاکستان بن لے اور خالص پاکستانی امتحان میں شرکت کریں؟ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ابھی دو ماہ تک انگریز کاراج ہے۔ وہ انگریز ہی امتحان میں دباؤ ہے کہ چنانچہ ناچار اسی رات میرٹھ روانہ ہوئے۔ میرٹھ میں امتحان سے فارغ ہو کر پشاور لوٹے تو اپنے ساتھ ریگولر کمیشن کے علاوہ اپنا پرانا دوست نانسی میونس بھی لے آئے۔ دو دن بعد پشاور کے فٹری ہسپتال سے رخصت ہونے لگے تو انگریز نرس نے (جس نے چوری چھپے ہمارے خطوط پڑھنے کے علاوہ یاد بھی کر لئے تھے) ہمیں ہسپتال میں گھسیٹ کر گزارنے کا مشورہ دیا اور دھمکی ملا جلا کر دینے اور سٹاف سرجن کے کان میں ایک ایسی جھپتی سی سرگوشی کی کہ غریب نے فی الفور ہمارے لئے چھٹی کی سفارش کر دی اور خود ہفت بھر کان میں میں گھیسرین ڈلو اتا رہا۔۔۔ چند روز بعد ہم مری میں تھے۔

بیسل ہوٹل مری کا کمرہ نمبر ۲۶ ایک منگسٹر مزاج سامنگل کمرہ ہے لیکن ہمارے لئے عقیم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کمرے میں ہم پر ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی صبح طلوع ہوئی۔ اسی کمرے میں ریڈیو پاکستان کا پہلا نشریہ سنا۔ گویا اسی کمرے میں وطن عزیز کی آزادی کی ابتداء ہوئی۔ مگر اسی کمرے میں اپنی آزادی کا خاتمہ بھی ہوا۔ یعنی وہ خاتون جو اس شب ہمارے ساتھ شریک بزم تھی دو سرے روز شریک حیات بن گئی اور وہ آزادہ رو نیم لٹھیں کہ

ہم تن کو دے بنو انوں کے لئے ایک تعلیمی منصوبہ تیار کرنا تھا۔ حقیقت میں ایسے اہم کام کے لئے تو لارڈ میکالے یا مسٹر شریف کی ضرورت تھی۔ بھلا ہم خاک نشین سپاہیوں کو تعلیمی اصلاحات سے کیا رشتہ؟ لیکن حکم حاکم تھا اور ہمیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ہماری قابلیت کے مقابلے میں کام اگرچہ مشکل ہے لیکن بے کرنے کے قابل۔ لہذا ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس محنت سے کام لیا جسے شائق کہتے ہیں اور قبائلی جوانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اپنا تمام تر زور قلم بلکہ خون جگر صرف کر کے ایک سکیم بنا ڈالی۔ پھر پورے جوش اور واجبی خودوش کے ساتھ اسے عملی جامہ پہنانا شروع کیا اور نتیجہ یہ رہا کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم خود جاسے سے باہر تھے۔ خوشی سے 'نیں' پینے سے! بالغ کو پڑھانا یوں بھی مشکل کام ہے۔ لیکن بالغ بھی ہو اور پشیمان بھی تو پھر یہ کام کسی مشکل کشا کے بس کا کافی ہوتا ہے۔ ہم یوں تو کچھ نہ تھے لیکن غلام مشکل کشا ضرور تھے۔ اللہ کا نام لیا اور خیر سے لے کر جہن تک قبائلی سپاہیوں پر در علم وا کر دیا۔

یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ہمارے تیار کردہ زیور تعلیم نے قبائلی زندگی میں کیا آراغ بکھیرا کی ہمارے لئے کچھ کتنا مشکل ہے لیکن ہماری سکیم راج ملک راج ہے اور پشیم مومن شاہ اور ہم کبھی کبھی چپکے چپکے سے ایک بار دوسرا سفر بھی کر چکے ہیں کہ شاید

ثبت است بر جریہ عالم دوام

یہ اور بات ہے کہ جریہ عالم کا قبائلی صفحہ کسی کی نظر سے گزرے گا یا نہیں۔ لیکن قاری محترم 'اس فخر نعتی کا گمان زندانہ نہ کیجئے گا۔ ہم نے زندگی میں اگر کوئی جامہ ادا کرنا نہیں چاہا ہے تو دوہی ہے اور عاقبت میں ہمارے پاس کچھ اٹاٹا ہو گا تو یہی سکیم ہوگی۔ گویا یہی ہماری مسدس حالی ہے۔۔۔ ہاں ایک اجر ہمیں اسی دنیا میں فوری طور پر بھی مل گیا یعنی پشتو سیکھ لی اور ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ پشتو بولنا بھی کس قدر مقوی ٹانک (Tonic) ہے۔ حوکنہ؟

ان دنوں ملک میں ایک سیاسی انقلاب کوٹ لے رہا تھا۔ قائد اعظم اور پنڈت نہرو دہلی میں لارڈ مونٹ نیشن سے مل کر انگریزی راج کا قہقہہ تمام کر رہے تھے اور اڑائی سی خبر تھی کہ ملک آزاد ہونے والا ہے۔ ادھر اچانک ہمیں حکم ملا کہ ۶ جون ۱۹۴۷ء کو ریگولر کمیشن کے

قاہرہ سے لے کرمانڈلے تک عشق کی دسترس سے محفوظ رہا تھا، مری پہنچ کر اسیر اللہ ہو گیا۔  
 بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا  
 اور یہاں سے ایک دوسری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

UrduPhoto.com

- 1۔ یہ دو سال بعد کی بات ہے کہ فرخیز کو رکاؤ شہزادہ صدار میں قتل ہوا جس میں پہلے آپاد کاروں میں سے تھے۔
- 2۔ یہی قاتل ہے۔
- 3۔ انگریزوں کا خوف بالکل بجا تھا۔ چانچ مار بعدی پاکستان وجود میں آیا اور انگریز انفریا تو رخصت ہو گئے لیکن ہمارے خانہ زادوں میں شمار ہوتے تھے۔
- 4۔ اہل بدست میں رقص و سجاد کی محفل کو کہتے ہیں۔
- 5۔ ہمارے کان بدست سے آواز آتا ہے وہ ہے۔
- 6۔ کیا آپ بھی بات انگریزی میں کہنے کی ذمت کو ادا کریں گے؟ آپ کی بدست میری قسم سے ادا کرتا ہے۔